اسلام کا نظامِ قانون

مرتبہ

غلام علی

10

المملكة العربية السعودية
رئاسة ادارات البحوث العلمية
والافتاء والدعوة والارشاد

مع تحيات
هيئة التوعية الاسلامية في الحج
مكة المكرمة

اسلام کا نظامِ قانون

KINGDOM OF SAUDI ARABIA

General Directorate
of Scientific Research and
Ifta and Da'wa and Guidance Affairs

WITH THE COMPLEMENTS OF THE
Office of Islamic Guidance In Hajj
MECCA AL-MUKARAMA

غلام علی

الإسلام وأوضاعنا القانونية

باللغة الأوردية

تأليف

عبدالقادر عودة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مندرجات

پہلا حصہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ (از مترجم)

تراجم کا یہ مجموعہ، جو ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے، دو حصص پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ عالمِ اسلام کی مشہور دینی تحریک "الاخوان المسلمون" کے نائب مرشدِ عام الشہید عبدالقادرؒ عودہ کی کتاب "الإسلام و أوضاعنا القانونية" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بیشتر قبل ازیں ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے، صرف چند اوراق کا ترجمہ اتفاق سے اشاعت پذیر نہ ہو سکا تھا، اُسے بھی یہاں شامل کر دیا گیا ہے۔ شہید مرحوم کا یہ کتابچہ اسلام کے قوانینِ شرعیہ پر فرداً فرداً یا جزءً جزءً کوئی تفصیلی بحث نہیں کرتا۔ مفصل بحث کا آغاز اُنھوں نے اپنی ایک دوسری مبسوط کتاب میں کیا تھا، جس کی صرف پہلی جلد شائع ہو سکی اور

قبل اس کے کہ وہ اپنی اس کتاب "التشریع الجنائی الاسلامی" کی تکمیل کرتے، مصر کی فوجی آمریت نے انھیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

"الإسلام وأوضاعنا القانونية" کے ذریعے سے مصنف نے جو خدمت سرانجام دی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں اصولی حیثیت سے انھوں نے قانون کی حقیقت و ماہیت اور تنظیم معاشرہ کے ضمن میں اس کی صلاحیت و اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے بعد انسانی قانون اور الہامی قانون کے بنیادی امتیاز کی نشان دہی کرتے ہوئے قوانینِ شرعیہ کی فوقیت اور برتری کے دلائل پیش کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک داعیانہ جوش کے ساتھ اور والہانہ انداز میں یہ بتایا ہے کہ مسلمان ان قوانین کو ترک کرکے کس طرح دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں اور ان قوانین کو اخذ کرکے کس طرح وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت و طاقت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک مسلمان اگر کھلے دل سے، اور نیک ارادے سے ان اوراق کا مطالعہ کرے گا تو اس کے اندر ایک طرف تو شرعی قانون کا علم حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا، اور دوسری طرف اس کے اندر نظام شریعت پر عمل پیرا ہونے کا، اور

چاردانگِ عالم میں اُسے قائم کرنے کا ولولہ بیدار ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مصنّفِ شہید کا مقصدِ تالیف یہی تھا اور مترجم کے پیشِ نظر بھی یہی مقصد ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے اسباب فراہم کرے اور مصنّف و مترجم کی مساعی کو مشکور فرمائے۔ آمین!

اِس مجموعے کے دُوسرے حصّے میں چند ایسے تراجم یکجا کر دیئے گئے ہیں جو خود شہید مرحوم کی تالیف کے مطالب و معانی سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔ ہر مضمون اور صاحبِ مضمون کا مختصر تعارف مضمون کے آغاز میں کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا مضمون "الاخوان" کے بانی الاستاذ الامام حسن البنّاء شہید کا ہے، دُوسرا اور تیسرا مضمون دمشق کے کلیۃ الشریعہ (لا کالج) کے پروفیسر شیخ مصطفٰے احمد الزرقاء کا ہے۔ ان کا شمار بھی "اخوان" کے قریبی ہمدردوں اور معاونین میں ہوتا ہے۔ وہ ایک دینی حیثیت رکھنے والے قانون دان ہیں اور متعدد تصانیف کے مالک ہیں۔ یہ تینوں مضامین ماہنامہ "المسلمون" سے لیئے گئے تھے اور ان کا ترجمہ بھی ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں چھپ چکا ہے۔ ان میں سے الزرقا کے دُوسرے مضمون کا ترجمہ رفیقِ محترم جناب سید وصی مظہر صاحب ندوی نے کیا تھا اور انہی کے اِذن و شکریہ کے ساتھ میں اِسے شاملِ اشاعت کر رہا ہوں۔ سب سے

آخری مضمون مَیں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ اِس طرح کے مضامین و مباحث کی انگریزی لٹریچر میں کمی نہیں ہے۔ مَیں نے صرف نمونۃً ایک مضمون لے لیا ہے جس سے بآسانی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ دین اَور قانون کے ناگزیر علاقے کو جدید و قدیم اَور مغرب و مشرق کے سب ذی علم اَور ذی فہم افراد تسلیم کرتے ہَیں اَور دینی بُنیادوں پہ قانونی نظام برپا کرنے کے مطالبے پہ "ملائیت" اَور "دقیانوسیت" کی پھبتی چُست کرنا یا تو محض جہالت ہے یا بڑی شرارت۔

الامام حسن البنّا رحمہ اللہ علیہ کی شخصیت اَور ان کے حالات زندگی سے تو، مَیں سمجھتا ہُوں، پاکستان کے مُسلمان بالعموم آشنا ہَیں اَور ان کی سیرت و سوانح پر مستقل تالیفات موجُود ہَیں، لیکن عبدالقادر عودہ شہید کے حالات سے یہاں لوگ عام طور پہ متعارف نہیں ہَیں۔ اِس لئے مَیں مناسب بلکہ ضرُوری خیال کرتا ہُوں کہ ان کے سوانحِ حیات یہاں بالاختصار بیان کر دُوں۔

عبدالقادر رحمہ اللہ کی ولادت کی تاریخ اَور بچپن کے حالات، افسوس ہے کہ اِس وقت میرے علم میں نہیں آ سکے۔ البتّہ اِتنا معلوم ہَے کہ وُہ ابتدائی تعلیم سے فراغت

پاکر قانون کی تعلیم کے لئے "کلیۃ الحقوق" (لا کالج) میں داخل ہوئے۔ شباب کے اس پُرفتن دور میں بھی ان کی زندگی کا ملّا بے لوث اور ہر طرح کی بے اعتدالی اور بے راہ روی سے بالکل پاک رہی ۔ ۱۹۳۰ء میں کالج سے فارغ ہونے والوں میں ان کا نام سرفہرست تھا۔ اس کے بعد انھوں نے حکومت کی ملازمت اختیار کی اور مختلف مناصب پر مامور رہے لیکن اس زمانے میں بھی انھوں نے اپنی دینداری اور ضمیر کی آزادی پر آنچ نہیں آنے دی ۔ ان ایام میں ان کی بے باکانہ جرأتِ ایمانی کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے ۔ سعدی حکومت کے عہد میں وہ مشرقی خطۂ سویز میں کالج کے انتخابی حلقے کے نگران تھے اس زمانے میں حسن البنّا شہید اسماعیلیہ سے مصری پارلیمنٹ کے لئے انتخاب لڑ رہے تھے اور سعدیوں کی حکومت انگریزوں کی شہ پاکر امام شہید کو شکست دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی ۔ اور اس کے لئے ہر طرح کے جبر و اکراہ اور مکر و فریب کو کام میں لا رہی تھی ۔ عدل و انصاف کا اس طرح خون ہوتا دیکھ کر عودہ مرحوم سے نہ رہا گیا ۔ وہ خود اسماعیلیہ پہنچے، وہاں ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کرکے اس میں ایک مفصل اور زوردار تقریر کی جس میں عوام کو جرأت اور آزادی سے حقِ رائے دہی استعمال کرنے پر

اُبھارا اور اُنھیں اطمینان دلایا کہ اگر اُن پر کوئی جور و تشدد ہوگا تو وُہ خود بحیثیت ایک انتخابی عہدہ دار کے مظلومین کی پُوری مدد اور پشت پناہی کریں گے ۔

اس کے بعد عبدالقادر مرحُوم قاضی یعنی جج کے منصب پر فائز ہُوئے ۔ اس دوران میں بھی وُہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو بے لاگ طریق پر نباہتے رہے ۔ اسی اثنا میں مرحُوم "الاخوان المسلمون" کے باقاعدہ رُکن بن گئے ۔

۱۹۵۱ء میں اخوان کے مُرشدِ عام شیخ حسن الہضیبی نے انھیں قضا سے مستعفی ہو جانے اور تنظیم کے لئے ہمہ تن وقف ہو جانے کا مشورہ دیا ۔ چنانچہ عدالتی منصب سے فوراً سبکدوش ہو گئے اور آپ کو نائب مُرشدِ عام منتخب کیا گیا ۔ اپنی معاش کے لئے آپ نے پرائیویٹ وکالت شروع کر دی اور تھوڑی مُدت میں آپ کا شمار بہترین وُکلا میں ہونے لگا ۔ دورانِ ملازمت میں آپ نے جدید قانون کے ساتھ ساتھ اسلامی فقہ و قانون کا بھی مطالعہ جاری رکھا اور دونوں پر آپ کی نگاہ بہت وسیع ہو گئی ۔ اس موضوع پر تالیف و تصنیف کا کام بھی آپ نے شروع کر دیا تھا ۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں آپ نے قانون کے تقابلی مطالعے کے نتائج اپنی مشہور تصنیف "التشریع الجنائی

الاسلامی" جلد اوّل کی شکل میں پیش کئے ۔ اِس کتاب کو بڑی علمی شہرت نصیب ہوئی اور ۱۹۵۱ء میں اِس کتاب کو فؤاد الاوّل لا پرائز کے لئے منتخب کیا گیا ۔ اِس انعام کی مقدار ایک ہزار مصری گنی (قریب پندرہ ہزار روپیہ) تھی ۔ شاہِ مصر یہ انعام دینے پر آمادہ تھا، بلکہ اُس کی خواہش تھی کہ اِس کتاب کی بین الاقوامی طور پر اشاعت مصر کے لئے ناموری کا موجب ہو ۔ مگر اُسے کتاب کی دو عبارتوں پر اعتراض اور اُن کے اخراج پر اِصرار تھا ۔ اِن عبارتوں کا مفاد یہ تھا کہ اسلام میں ملوکیت اور نسلی بادشاہت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے اور کوئی حکمران قانون سے بالاتر نہیں ہے، بلکہ اسلامی قانون کی نگاہ میں حاکم و محکوم بالکل مساوی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ مستبد سلاطین کی نگاہ میں ایسے خیالات کا حامل اِنسان انعام و اکرام تو کیا جان کی امان بھی نہیں پا سکتا ۔ لیکن عبدالقادر عودہ شہید نے اِن عبارتوں کو نکالنے یا بدلنے سے صاف اِنکار کر دیا ۔ اور اِس طرح نہ صرف دولت، شہرت اور شاہی تقرب کے امکانات پر لات مار دی، بلکہ بارگاہِ شاہی میں پہلے سے بھی زیادہ مبغوض قرار پائے ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مشائخ ازہر فاروق کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے اور موجودہ حکّام اُس کے تاج و تخت کی حفاظت کا فریضہ سر انجام دے رہے تھے ۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں سرزمینِ مصر ایک اور انقلاب سے دوچار ہوئی۔ فوج نے جنرل نجیب کی قیادت میں شاہِ فاروق کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس انقلاب میں اخوان نے اہم کردار ادا کیا۔ جب تک جنرل نجیب کے ہاتھ میں قیادت رہی اخوان اور انقلابیوں کے تعلقات خوش گوار رہے۔ چنانچہ جنرل موصوف نے تشکیلِ دستور کے لئے جو کمیشن مقرر کیا تھا اس میں عبدالقادر شہید بھی شامل تھے اور انھوں نے مصری دستور کو اسلامی اور جمہوری اساسات پر بنانے کی سفارشات پیش کی تھیں[1]۔ لیکن بعد میں واقعات نے عجیب پلٹا کھایا اور نوبت بایں جا رسید کہ اخوان کے مرشدِ عام (الھضیبی)، نائب مرشدِ عام (عودہ شہید) اور اخوان کے چار دیگر معتدر رہنماؤں (شیخ محمد فرغلی، یوسف طلعت، ابراہیم طیب، ہنداوی دویر) کو ۷ دسمبر ۱۹۵۴ء کے روز موت کی سزا دے دی گئی۔ ان میں سے مرشدِ عام کی سزا کو تو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن دوسرے اصحاب کو

---

[1] شہید مرحوم کے علم و فضل کے پیشِ نظر ۱۹۵۳ء میں لیبیا کے دستور کی ترتیب کے لئے بھی ان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

۸ دسمبر ۱۹۵۴ء کی صبح کو جبکہ فضائے عالم اس ظلم و عدوان کے خلاف صدائے احتجاج سے گونج رہی تھی، آدھے آدھے گھنٹے کے وقفے سے قاہرہ کے جیل خانے میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا ....

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ - فَرِحِيْنَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ - يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّ أَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ -

تمام شہدائے اخوان نے نہایت صبر و ثبات اور خندہ پیشانی کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا اور اللہ کے ذکر اور اس سے استغفار کے ساتھ موت نہیں، بلکہ حیاتِ جاوداں کا استقبال کیا۔ استاذ عبدالقادر عودہ شہید کے بارے میں خبر رساں ایجنسیوں نے بتایا ہے کہ آخری وقت پھانسی پانے والوں کا لباس زیبِ تن کر کے انھوں

نے فرمایا کہ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجھ بے گناہ کا خون لعنت کی شکل میں میرے قاتلوں پر مسلط ہوگا" پھر اُنھوں نے ایسے الفاظ کہے جو حضرت خبیبؓ کے اُن اشعار سے ملتے جلتے ہیں جو اُنھوں نے اپنی شہادت کے وقت پڑھے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ عبدالقادر شہید نے یہی اشعار پڑھے ہوں اور غیر ملکی خبر رسانوں نے انہی کا ترجمہ نشر کیا ہو۔ وہ اشعار یہ ہیں:-

ولست بمبدٍ للعدو تخشعا
ولا جزعا إني إلى الله مرجعي!

[میں دشمن کے سامنے عاجزی کا اظہار نہ کروں گا ——— اور نہ واویلا مچاؤں گا ، میرا لوٹنا تو اپنے رب کی جانب ہے ۔]

ولست أبالي حين أقتل مسلما
على أي جنب كان في الله مصرعي

[اور جب میں مسلمان ہوتے ہوئے قتل ہو رہا ہوں ، تو مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ اللہ کی راہ میں میں کس کروٹ گرتا ہوں ۔]

وذلك في ذات الإله وإن يشا
يبارك على أوصال شلو ممزع

[اور یہ سب کچھ اللہ کے لئے ہے اور اگر وہ چاہے گا تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کو برکت دے گا۔]

چشم دید راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد عودہ شہید مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے اس سرعت سے پھانسی کے تختے کی طرف بڑھے کہ جلادوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ..... رحمہ اللہ وسعہ المغفران وسقی ضریحہ صیّب الرضوان۔

لا و دعتك ثم تدمع مقلتي
إن الدموع هي الوداع الثاني
في فرقة الإخوان شغل شاغل
والموت حقاً فرقة الإخوان

غلام علی
۲۰ رمضان المبارک ۱۳۷۴

پہلا حصّہ

تقدیم و اعتذار

الحمد للہ الّذی ھدانا لھذا و ما کنّا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمّد رسول اللہ۔ اللّٰھمّ اغفرلنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا واربط علیٰ قلوبنا و اٰتنا نصرک الّذی وعدتنا۔

موجودہ قانون سے معذرت

سب سے پہلے میرے لیے ضروری ہے کہ میں مصر کے قانونِ ملکی کے بارے میں اپنا موقف واضح کر دوں۔ اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک جج کے میں اس قانون کی محافظت، مدافعت اور تنفیذ کا ذمہ دار ہوں اور مجھ سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ میں اس

قانون کی، جیسا کچھ بھی یہ ہے، صرف تعبیر و تطبیق کروں، اس کے استحکام کے لیے کوشش کروں اور اسے توہین و تذلیل سے بچاؤں۔ لیکن قانون ہی کی خاطر اور اس کی خدمت کے جذبے ہی کے تحت میرا ارادہ ہے کہ میں موجودہ قوانین پر تنقید کروں۔ میں قانون کی موجودہ ہیئت پر تو ضرور اعتراض کروں گا لیکن قانون کی "روح" اور اس کی "حقیقت" کی ہرگز مخالفت نہیں کروں گا۔ میری اس بحث کا اگر ایک نتیجہ یہ بھی نکلے کہ قوانین موجودہ کے تقدس و کمال کا تصور لوگوں کے دلوں میں قائم نہ رہے اور وہ اس کی اصلاح و تکمیل کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو یہ نفسِ قانون کی صحیح معنوں میں ایک خدمت ہوگی اور اس سے میری تنقید کے لیے بھی ایک معقول وجہِ جواز فراہم ہو جائے گی۔

اظہارِ خیال قانوناً ممنوع ہے

موجودہ قوانین کی رو سے ملازمینِ حکومت اور خصوصاً عدلیہ کے کارکنوں کے لیے مسائلِ عامہ پر اظہارِ رائے کرنا حرام ہے۔ اسے سیاسی سرگرمی کا نام دے کر غیر قانونی فعل قرار دے دیا گیا ہے۔ قانون کے بنانے والوں نے ان "سیاسی مسائل" کی فہرست میں تمام سیاسی، اقتصادی، مالی اور معاشرتی معاملات کو شامل کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ہر وہ مسئلہ جس کا تعلق فرد، جماعت، قوم، قومی آزادی اور

قومی عزّت و شرف سے ہے یا جس کا تعلق نظامِ حکومت اور بین الاقوامی معاملات سے ہے وُہ ازرُوئے قانون ایک ملازمِ حکومت کے لیے اظہارِ خیال کا موضوع نہیں بن سکتا۔ موجودہ قانون کے مصنّفین کا منشا یہ ہے کہ جیتا جاگتا اور سوچتا سمجھتا اِنسان ایک بے جان اور بے حس مشین بن کے رہ جائے وُہ آنکھیں بند کرلے اور سننا چھوڑ دے، زبان بند کرلے اور بولنا چھوڑ دے، اپنے شعور، احساس اور فکر کو بالکُل معطّل اور مفلوج کر دے۔

کیا ایسا تجرّد و تعطّل ممکن ہے؟

مگر کیا "لب بلبند و گوش بند و چشم بند" کی اِس روش پر کاربند ہونا اِنسان کے لیے عقلاً اور عملاً ممکن ہے؟ مثلاً کیا ایک جج کے لیے یہ ممکن ہے کہ وُہ جذبات و احساسات سے بالکل عاری ہو جائے، حالانکہ وُہ دن رات اجتماعی مسائل سے دوچار ہوتا ہے؟ وُہ مختلف افراد کو اور جماعتوں کو زندگی کے میدان میں ایک وسیع کشاکش اور آویزش میں مبتلا دیکھتا ہے۔ وُہ محرُوم لوگوں کو مصائب کا شکار ہوتے دیکھتا ہے۔ وُہ مظلوم محنت کاروں کی آہیں سنتا ہے۔ وہ اجتماعی غربت و افلاس، معاشی ظلم و جور، سیاسی ناانصافی اور جبری استحصال کے درد انگیز مناظر کا صبح و شام مشاہدہ کرتا ہے۔

جس قوم کے سینے پر اجنبی تسلط کابوس بن کر سوار ہو ـــــ

ایسا تسلط جو پورے وطن پر چھایا ہوا ہو، جو رزق کے سارے سرچشموں پر قابض ہو، جو ملک کی ساری دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہو، جو اس کی آزادی کو پامال کر رہا ہو، جو اس کی داخلی اور خارجی سیاست کو اپنا تابع فرمان رکھنا چاہتا ہو، جو نیک طینت اور باضمیر ابنائے قوم کے خلاف ان کے ایسے بھائیوں کو استعمال کر رہا ہو جنھوں نے شیطان کے ہاتھ اپنی جان، دین اور وطن کو فروخت کر دیا ہو، جس قوم کے بوڑھوں اور جوانوں نے اس طرح کے اجنبی تسلط میں آنکھیں کھولی ہوں اور اسی کے دور میں اپنی آنکھیں بند کر رہے ہوں، کیا ایسی قوم کا ہر فرد ایک غیر جانبدار تماشائی بن کے اپنی زندگی گزار سکتا ہے؟ جس ملک کی عزت کو غیر ملکی استعماد نے خاک میں ملا دیا ہو، اس کی آزادی کو پامال کر رکھا ہو، مادی اور انسانی حیثیت سے اسے بالکل فرومایہ اور دیوالیہ بنا کر چھوڑ دیا ہو، اس کے گوشے گوشے میں فساد برپا کر دیا ہو، اس کے بسنے والوں میں ایک کے اندر دوسرے کے خلاف بغض و عناد پیدا کر دیا ہو، انھیں ایسی متفرق ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہو، جن میں سے ہر ٹولی اپنے ہی حال میں مست ہو، جس کے افراد بظاہر متحد نظر آتے ہوں مگر جن کے

دل ایک دوسرے سے پھٹ چکے ہوں، جس ملک کی نسلیں اجنبی استبداد کے خلاف کشمکش میں ختم ہو رہی ہوں، جس ملک کے سامنے آزادی کا مل یا مرگِ ذلت آمیز کا سوال درپیش ہو لیکن جس کے شہریوں کا یہ حال ہو کہ یہی غیر ملکی سامراج اگر انھیں چند کرسیاں مستعار دے دے تو وہ شہری ان کرسیوں پر براجمان ہو کر ایک دوسرے سے لڑنا، ایک دوسرے کی گردنیں مارنا اور ایک دوسرے کا خون بہانا شروع کر دیں، کیا ایسے ملک کی عدالتوں کا کوئی جج ان ہنگامہ ہائے رستخیز سے اور ان غلغلہ ہائے دار و گیر سے الگ تھلگ رہ سکتا ہے؟

جج لاقانونیت کا تماشائی بن کے نہیں رہ سکتا

کیا ایک جج کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے ملک میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرے، جہاں ملزمین سے کردہ یا ناکردہ خطاؤں کا اعتراف کرانے کے لیے اُن کے ناخن گوشت پر سے اکھیڑ دیے جائیں، انھیں بار بار اس طرح پیٹا جائے کہ وہ ہر مرتبہ بے ہوش ہو جائیں، ان کے جسم آگ سے داغے جائیں، ان کی کھالیں کوڑوں سے ادھیڑ دی جائیں، انھیں کھانے پینے اور دوا سے محروم کر دیا جائے، اُن کی حیا کو ننگا کر کے مجروح کیا جائے، اُن کے بدن کے پوشیدہ مقامات میں

لکڑیوں اور لوہے کی سلاخوں کو داخل کیا جائے۔ انھیں دھمکیاں دی جائیں کہ ان کی ماؤں، بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا جائے گا اور پھر ان ملزمین کے گھروں میں پولیس کئی کئی دن اور کئی کئی ہفتے گھسی رہے جب کہ وہاں عورتوں کے سوا کوئی نہ ہو، قانون کے نگہبانوں کو ان تمام حالات یا ان میں سے بیشتر حالات کا علم ہو مگر وہ اس بارے میں کوئی ادنیٰ ترین کارروائی بھی نہ کریں، پھر ان تمام شرمناک اور انسانیت سوز مظالم کو عدالتوں کے نوٹس میں لایا جائے، مظلوم عدالت میں خود پیش ہو کر یہ تمام واقعات اپنی زبان سے دہرائیں، باقاعدہ دستاویزات اور طبی سندات شہادت میں پیش کی جائیں لیکن حکومت ان زیادتیوں کی تحقیق و تفتیش کے لیے اور قانون اور محافظینِ قانون کی ساکھ کو بچانے کے لیے کوئی قدم اٹھانے پر بھی آمادہ نہ ہو۔

کیا ایک جج کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسی دنیا میں بالکل بے تعلق ہو کر رہے جہاں قانون کا احترام بالکل ختم کر دیا گیا ہو اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہو۔ جہاں قانون بیچارہ لوٹ کھسوٹ اور مظالم کے جواز کا آلہ بن کے رہ گیا ہو۔ جہاں حکومت کے مناصب اور ہر طرح کے فوائد سے صرف وہ لوگ

متمتع ہو سکتے ہوں جو حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں جہاں نفاق کامیابی کا واحد ذریعہ خیال کیا جاتا ہو اور اباحیت و بداخلاقی کو جاہ و منزلت کی اولین شرط سمجھا جاتا ہو؟ کیا ایک جج اس بات کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے وطن میں عہدِ جاہلیت کے سے حالات کا دور دورہ ہو۔ زیردست اپنا خون پسینہ ایک کرکے کمائیں اور زبردست اسے چھین کر مزے سے بیٹھ کر کھائیں کمزور کو اپنے جسم اور روح کا رابطہ قائم رکھنے کے لیے سوکھا نوالہ اور میلا چیتھڑا بھی میسر نہ ہو اور طاقتور سونے اور چاندی سے کھیل رہا ہو مگر کمزور شکایت کرے تو قانون اس کے خلاف حرکت میں آجائے۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ کمزور اپنے ماحول اور قانونِ مروجہ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دے۔

جج دین سے انحراف کو بھی خاموشی سے نہیں دیکھ سکتا

پھر کیا ایک جج اس بات کو بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا ہے کہ ایک ملک کے دستور میں تو یہ دفعہ درج ہو کہ ریاست کا دین اسلام ہے لیکن اس کی حکومت اور حکمران اسلام کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کریں۔ خادمانِ اسلام کے خون کے پیاسے بن جائیں۔ تعاون علی البر والتقویٰ

کی خواہش رکھنے والوں کو نشانہ ستم بنالیں اور تعاون علی الإثم والعدوان کے مرتکبین کی سرپرستی کریں ؟ کیا ایک جج ایسے حالات میں نا طرفدار رہ سکتا ہے جب کہ پورا ملک اخلاقی فضائل و محاسن سے عاری ہوتا جا رہا ہو۔ دیانت اور حسنِ اخلاق کا نام و نشان مٹ رہا ہو اور لوگ موجودہ لیڈروں کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دینے لگے ہوں؟

جج غیر جانبدار کب رہ سکتا ہے

جج صرف اس قوم کے اندر غیر جانبداری کا رویہ اختیار کر سکتا ہے جہاں ابنائے قوم اپنے قانون کا لفظاً اور معناً احترام کرتے ہوں اور ضعیف اور قوی یکساں طور پر اس کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوں لیکن جس قوم کا یہ حال ہو کہ وہ ایک دین کو قبول کرے اور پھر اس پر کاربند نہ ہو۔ قوانین بنائے اور پھر انہیں نافذ نہ کرے۔ حق، عدل اور انصاف کی علمبرداری کا دعویٰ کرے لیکن اس پر عمل نہ کرے۔ جو قوم تواصی بالحق، دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام نہ دے، اس قوم کا جج اگر بے تعلق اور غیر جانبدار رہنا بھی چاہے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔

بہت سی جبینیں ایسی ہیں جن پر ان سطور کے پڑھ لینے کے بعد شکن پڑ جائیں گے۔ بہت سے چہرے ایسے ہیں جو غضب آلود

ہو جائیں گے لیکن میں ان صنم پرستوں سے کہتا ہوں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے یہ سارے قوانین و ضوابط عصرِ حاضر کے لات و منات ہیں! ان کی اطاعت کر کے ایک مسلم اپنے اللہ کو ناراض کرتا ہے۔ ان کی وساطت سے مسلمانوں کی حکومتیں اللہ کے حلال کو حرام اور اللہ کے حرام کو حلال کر رہی ہیں۔

ان بتوں کے پجاریوں کو یہ بات غیظ و غضب میں مبتلا کر دے گی کہ اس بت خانے کے ایک کاہن نے ان بتوں کے خلاف کفریہ بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ ان لوگوں کو حیرت ہوگی کہ قانون مذہب کے خادموں میں سے ایک خادم نے ایسی غداری کیوں کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہر طرف سے آواز بلند ہوگی "لوگو! اپنے بتوں کی نصرت و تائید کے لیے اٹھو۔ اس شخص کو پکڑ لو، قبل اس کے کہ یہ تمہارے بتوں کو چکنا چور کر دے" لیکن یاد رکھو یا اس بغاوت کو دبانا ناممکن ہے۔ یہ ایک شخص کا دعویٰ یا نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی دلی تمنا ہے۔ یہ ندائے انسان نہیں بلکہ ندائے ایمانی ہے۔ یہ اسلام کی راہ میں ایک کشمکش ہے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اسی رستے سے ہم اللہ تک پہنچا جاتے ہیں۔

ہوتا تو میری زبان قوانینِ حاضرہ کی حمد میں اسی طرح تر ہوتی جس طرح یورپ والوں کی زبانیں ہیں: اگر میں جاہل مسلمان ہوتا تب بھی میں مغربی اقوام کی تقلید کرتا اور اس قانون پر ایمان لے آتا۔ لیکن مجھ پر اللہ کا یہ فضل ہے کہ میں ایک ایسا مسلمان جج ہوں جسے بہت سے مسلمان ججوں سے زیادہ اسلام کا علم حاصل ہے۔ اور مجھے موجودہ قوانین اور قوانینِ شرعیہ کے باہمی اختلاف سے جس حد تک واقفیت ہے اس حد تک واقفیت بہت تھوڑے قانون دانوں کو حاصل ہے۔

میری غیر جانبداری کفر ہے

موجودہ قانون شخصی معاملات، اجتماعی مسائل، نظامِ حکومت، فوجداری و دیوانی قوانین، اخلاقیات، سماجی عدل، حقوق و واجبات بین الاقوامی تعلقات سب سے بحث کرتا ہے۔ ان سارے مسائل کے بارے میں ایک مسلمان جج خالی الذہن اور جانبداری سے ماورا اسی شکل میں ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ اسلام کو ترک کر کے کفر کا انتخاب کر لے اور یا پھر گونگے اور بے عقل جانوروں کی طرح حیوانی زندگی بسر کرے۔ مسلمان کا دستورِ اساسی شریعتِ اسلامی ہے۔ قوانینِ موضوعہ میں سے جو قانون نصوصِ شریعت کے مطابق ہے یا اس کی روح اور مبادیات کے موافق ہے اسے ایک مسلمان بسر و چشم قبول کرے گا اور امرِ الٰہی

کے بموجب اس کی دل سے اطاعت کرے گا۔ جو قانون اس کے خلاف ہوگا مسلمان اسے پاؤں کے نیچے روندے گا۔ اسلام کی مخالفت کر کے کسی شے کا احترام نہیں کیا جا سکتا۔ کسی مخلوق کی ایسی فرمانبرداری نہیں کی جائے گی جس سے اللہ کی نافرمانی لازم آئے۔ ایک مسلمان اگر حرام کو حرام تسلیم کرتے ہوئے اس کا مرتکب ہے تو وہ فاسق ہے لیکن اگر وہ حرام کو حلال اور جائز سمجھتے ہوئے اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ کا کافر اور اسلام سے مرتد ہے۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ ایک سچا مسلمان خدا یا خلق کے سامنے فسق و کفر کی ان دونوں حالتوں میں سے کسی حالت میں اپنے آپ کو پیش کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔

لاطاعة فی معصیة اللہ

اسلام مسلمانوں پر واجب کرتا ہے کہ اولاً وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور ثانیاً اولی الامر کی اطاعت کریں۔ اسلام مسلمان پر یہ بھی واجب کرتا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی غیر اللہ کی اطاعت نہ کریں۔ پس اولی الامر کی کوئی ایسی اطاعت جائز نہیں جو اللہ کے دائرہ اطاعت سے مسلمان کو خارج کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں فرمایا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۔ (النساء ۵۹)

یہ آیت حکام کو امر کا حق دیتی ہے جس کی اطاعت محکوم پر واجب ہے لیکن ساتھ ہی یہ آیت حاکم کے حقوق اور محکوم کے واجبات کو فوراً مشروط اور مقید بھی کر دیتی ہے۔ حکومت کے لیے کسی ملازم یا غیر ملازم کو مخالف اسلام احکام دینا جائز نہیں ہے اور اسی طرح امور کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ امر کی اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہوئے کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق اور من امرکم من الولاة فی غیر طاعة الله فلا تطیعوه (مخلوق کی اطاعت خالق کی معصیت میں جائز نہیں حکام میں سے جو تمہیں اللہ کی فرمانبرداری کے خلاف حکم دے تو اس کی اطاعت مت کرو)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمان پر فرض ہے

اسلام مسلمان کے لیے یہ واجب قرار دیتا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی

سے روکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران: ١٠٤)۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ١١٠)۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ: ٧١)۔ اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: ٤١)۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (المائدۃ: ٧٩)۔

متعدد احادیث سے اس فریضے کی مزید تاکید و تشریح ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک خطبے کے دوران میں فرمایا تھا کہ "اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو: يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو (یعنی اس سے یہ مطلب نکال لیتے ہو کہ نجات کے لیے ذاتی نیکوکاری کافی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن

المنکر کی ضرورت نہیں ہے) حالانکہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے کہ "ما من قوم عملوا بالمعاصی وفیھم من یقدر ان ینکر علیھم فلم یفعل الا یوشك ان یعمھم اللہ بعذاب من عندہ" (جس قوم کے اندر بھی معاصی کا ارتکاب کیا جائے اور اس میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو ان برائیوں پر ٹوک سکیں مگر وہ ایسا نہ کریں۔ تو جلد اللہ تعالیٰ ان سب کو (یعنی برائی کرنے والوں اور اس پر ملامت نہ کرنے والوں کو) ایک عام عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس سلسلے کے چند دیگر ارشاداتِ نبویؐ درج ذیل ہیں:

لتامرنّ بالمعروف ولتنھونّ عن المنکر او لیسلطنّ اللہ علیکم شرارکم ثم یدعو خیارکم فلا یستجاب لھم	تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے رہو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے بُروں کو تم پر مسلط کر دے گا۔ پھر تمہارے اچھے دُعا کریں گے لیکن مقبول نہ ہوگی۔
ما اعمال البر عند الجھاد فی سبیل اللہ الا کنفثۃ فی بحر لجی وما جمیع اعمال	جہاد کے مقابلے میں نیک کام ایسے ہیں جیسے ایک بحرِ زخّار کے مقابلے ایک ذرا سا چھینٹا اور تمام اچھے کام

البر والجهاد في سبيل الله عند الامر بالمعروف والنهي عن المنكر الا كنفثة في بحر لجي.

جملہ جہاد فی سبیل اللہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بالمقابل ایسے ہیں جیسے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ذرا سا چھینٹا۔

افضل الشهداء امتي رجل قام الى امام جابر وامره بالمعروف ونهاه عن المنكر فقتل على ذلك فذلك الشهيد فمنزلته في الجنة بين حمزة وجعفر بئس القوم لا يأمرون بالقسط وبئس القوم لا يأمرون بالمعروف

میری اُمت کا بہترین شہید وُہ ہے جو ظالم حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر اُسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور پھر وُہ ظالم اُسے قتل کر دے یہ شہید ایسا ہے کہ جس کا مقام جنت میں حمزہؓ اور جعفرؓ کے درمیان ہو گا۔؎ بہت بُری ہے وُہ قوم جو عدل کا حکم نہ دے۔ بہت بُری ہے وہ قوم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے۔

؎ رحمتِ الٰہی سے کامل امید ہے کہ وہ مصنف اور اُن کے مظلوم رفقا کو یہ مقام عطا فرمائے گا۔ (مترجم)

ولا ینھون عن المنکر

من رأی منکم منکراً فلیغیّرہ بیدہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذٰلك اضعف الایمان۔	جو کوئی تم میں سے بُرائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُسے بدلے اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے بدلے اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو دل سے اُسے بُرا جانے اور اُس کے بدلنے کی خواہش رکھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

امر بالمعروف یہ ہے کہ لوگوں کو اس امر کی تبلیغ و تلقین کی جائے کہ وہ اپنے اقوال و افعال میں احکامِ شریعت کی پابندی کریں۔ نہی عن المنکر یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کی ترغیب دلائی جائے کہ وہ ان تمام اعمال کو ترک کر دیں جن کے ترک کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ یہ امر مسلمانوں میں متفق علیہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام مسلمانوں کی مرضی و اختیار اور صوابدید پر نہیں چھوڑ دیا گیا کہ چاہیں تو اسے کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ یہ کام ایک امرِ مستحسن و مستحب کے درجے میں نہیں ہے کہ اگر کر لیا جائے تو اچھا ہے اور نہ کیا جائے تو کچھ حرج نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں پر قطعی واجب ہے۔

اسے ادا کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اسے ترک کرنا یا اس کی ادائیگی میں کوتاہی دکھانا مطلقاً جائز نہیں ہے۔ یہ پوری امتِ مسلمہ پر ایک اجتماعی فریضہ ہے اور دنیا سے برائی کو مٹانے اور نیکی کو پروان چڑھانے کے لیے اس فریضے کو سرانجام دینا ضروری ہے۔ حکومتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ جماعتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ یہ کام کریں۔ صرف اسی صورت میں فساد اور منکر کا استیصال کیا جا سکتا ہے اور صلاح و تقویٰ کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے۔

موجودہ زمانے کا حال یہ ہے کہ اس میں برائی بہت پھیل چکی ہے افراد برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں نہ وہ خود رکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا انھیں روکتا ہے۔ حاکم اور محکوم مل کر اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں۔ حکومتیں مسلمانوں کے لیے ایسے قوانین وضع کرتی ہیں جو مسلمانوں کو کفر، شرک اور ارتداد کی طرف دھکیلتے ہیں۔ ان افسوسناک حالات میں ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ کوشش کا حق ادا کرے۔ ایک عالم خواہ ملازم ہو یا نہ ہو۔ خواہ جج ہو یا نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر اسلامی قوانین کو بدلنے کی کوشش کرے ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقصد میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ اور اس کے لیے اگر اپنے ہاتھ نہیں استعمال کر سکتے

تو اپنے دل سے، اپنی زبان سے، اپنے قلم سے اس کی تائید کریں۔

تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ "برّ اور تقویٰ" کے معاملے میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور "اثم اور عدوان" کے معاملے میں تعاون نہ کریں۔ اگر مسلمان اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد اور نصرت فرمائے گا اور باطل کے "اصنام وطواغیت" کو منہدم کر دے گا۔ مسلمانوں کی جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ بندہ اللہ کے کام میں جب اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ اگر مسلم کو غیر اسلامی قوانین کے خلاف لڑتے رہنا چاہیے۔ اس فرض کی ادائگی کے خلاف جہلا خواہ کچھ بھی کہتے یا کرتے رہیں وہ مسلم کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ مسلمان کے پاس اپنے فعل کے حق میں دینی حجت اور اس پر کامل یقین موجود ہو۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح واضح فرمایا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ (مائدہ: ۱۰۵)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم اپنی فکر کرو۔ وہ شخص تمہیں کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتا جو گمراہ ہو گیا ہے، بشرطیکہ تم ہدایت پر ہو۔

وظیفۂ قانون

قانون کا مقصد و منشا

اپنی رُوح اور حقیقت کے اعتبار سے قانون ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے انسانی معاشرے کو مفر نہیں ہے۔ اسی قانون کی وساطت سے اجتماعی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ مظالم کی روک تھام ہوتی ہے۔ حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔ عدل کو قائم کیا جاتا ہے اور اقوامِ عالم میں داخلی و خارجی ربط و نظم پیدا ہوتا ہے۔ بشری ضروریات ہی نے قانون کے ادارے کو جنم دیا ہے۔ اس کے وجود و ارتقا کو ممکن بنایا ہے اور اس کی اطاعت و احترام کو ایک پسندیدہ فعل کی حیثیت سے انسان کے دل و دماغ میں جاگزیں کیا ہے۔ معاشرے کے متفرق افراد ایک نظامِ جماعت سے اپنے آپ کو اس غرض سے وابستہ کرتے ہیں اور

قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں تاکہ ظلم و جور سے محفوظ رہیں اور امن و سلامتی سے زندگی بسر کر سکیں۔ قانون کی ضرورت اس وجہ سے بھی لاحق ہوتی ہے کہ اگر بہت سے افراد کے خلاف طاقت استعمال نہ کی جائے تو وہ ایسے افعال کر گزرتے ہیں جو بحیثیت مجموعی سوسائٹی کے مفاد کے منافی ہوتے ہیں اور اسی طرح وہ ایسے بہت سے نزاع بعض کی انجام دہی سے باز رہتے ہیں جو ان پر معاشرے کی جانب سے عاید ہوتے ہیں۔ بہرکیف اسی طرح کی بے شمار انفرادی و اجتماعی ضروریات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اجتماعی زندگی کو ایک قانونی نظام کی بنا پر استوار کیا جائے۔ اس بحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قانون انسانی معاشرے سے ماورا کوئی ایسی شے نہیں ہے جسے اجتماعی و انفرادی مصالح کو نظر انداز کر کے فرد یا جماعت پر جبراً مسلط کر دیا جاتا ہے۔ فی الاصل قانون کا مقصد بہبود ایصال منفعت اور دفع ضرر ہے۔

قانون کسی شکل میں ہو، کسی رنگ میں ہو وہ جماعت کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کا آلۂ کار ہے۔ اگر قانون تعلیم کو جبری اور لازمی قرار دیتا ہے تو اس لیے کہ یہ علم اور جہالت دور ہو۔ اگر قانون مجرموں کو سزا دیتا ہے تو اس غرض سے کہ امن قائم ہو اور جرائم کا سدباب

ہو اور اگر قانون ظلم کی ہر صورت کو ممنوع قرار دیتا ہے تو محض اس مقصد کی خاطر کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ہر شخص اطمینان کی زندگی گزار سکے۔ قانون کے وجود اور اس کے قہر و غلبہ کے لیے واحد وجہ جواز یہی ہے کہ وہ معاشرے کی خدمت اور سعادت کا موجب ہو۔ جو قانون اپنے اس حقیقی مقصد و مآل کے حصول میں ناکام رہے وہ سراسر باطل اور ناقابل قبول ہے اور کسی طرح کے احترام اور اطاعت کا قطعاً مستحق نہیں ہے بلکہ وہ اس امر کا سزاوار ہے کہ اسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اگر ہم ایسے قانون کو دل سے تسلیم کریں گے یا اس کے سامنے اپنا سر خم کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم پورے معاشرے پر ظلم کر رہے ہیں اور اس کے حقوق کو پامال کر رہے ہیں۔

ہر قوم کا اپنا اپنا قانون ہے

قانون کے بارے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ مختلف عقاید و نظریات رکھنے والی اقوام کے قانونی نظام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور ہر قوم کا قانون اس کے افکار و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ قوم کے ماضی، حال اور مستقبل سے قوانین کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور ہر قانون میں قوم کے اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی تصورات کا عکس موجود ہوتا ہے۔ قومی مزاج کا اختلاف لازماً قانون کے اختلاف کی صورت

میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جاپان کا قانونی ضابطہ ہندوستان کے قانونی ضابطے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنی کہ جاپانی قوم ہندی قوم سے اپنے معتقدات و نظریات میں مختلف ہے۔ ہندی قوانین اور انگریزی قوانین کے درمیان اسی نسبت سے امتیاز موجود ہے جس نسبت سے امتیاز ان دونوں قوموں کے عقاید و افکار میں پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عام بول چال میں جب ہم کسی خاص مجموعۂ قوانین کو ایک خاص قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں تو یہ نسبت محض ظاہری نام کی حد تک نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک حقیقی ربط و تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے قوانین کی حفاظت و مدافعت کے لیے کمربستہ اور مستعد رہتی ہے اور اس کی توہین و تذلیل کو اپنی توہین و تذلیل خیال کرتی ہے۔ اسی کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ایک قوم کے متقنین اگر کسی دوسری قوم سے کوئی قانون مستعار لیتے بھی ہیں تو اسے جوں کا توں اپنے قوانین میں داخل نہیں کر دیتے بلکہ اس میں اس حد تک اصلاح و ترمیم کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے قانونی ڈھانچے میں نمل بے جوڑ معلوم ہو۔ ہر قوم اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ کسی دوسری قوم کی غلامی اور چاکری قبول کر لینے کی بدترین شکل یہ ہے کہ اس کے قوانین کو بے کم و کاست بلا ادنیٰ تغیر اپنے ہاں رائج کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

ایک قوم نے اپنی قومی انفرادیت کو خیرباد کہہ دیا اور دوسری قوم کی اطاعت کا قلادہ خود اپنی گردن میں ڈال لیا۔

بلادِ اسلامیہ کے لیے اجنبی قوانین

لیکن مقامِ افسوس ہے کہ مندرجہ بالا اصولِ قانون کو مصر میں اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں بہت بڑی حد تک پامال کر دیا گیا ہے۔ مغربی اقوام کے ضابطہ ہائے قوانین کے ایک بڑے حصے کو من وعن درآمد کر کے یہاں نافذ کر دیا گیا ہے۔ ان مسلمان ممالک کے اندر تیرہ سو سال تک کم وبیش اسلامی احکام وقوانین کو غلبہ اور فرمانروائی حاصل رہی ہے۔ ان ممالک کی عظیم اکثریت اسلام کے نظریۂ حیات پر ایمان رکھتی ہے اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کے اوامر ونواہی پر کاربند رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتی رہی ہے۔ جن لوگوں نے مغرب کے قوانین کو اخذ کرنا شروع کیا تھا ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کے حال اور ماضی کو بھی نگاہ میں رکھتے۔ لیکن ان مقلدین میں فہم وبصیرت کا مادہ بہت قلیل تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ممالک میں ایسے غیر مانوس اور بیگانہ قوانین کو بالادستی حاصل ہو گئی۔ جن میں نہ مسلمانوں کے ماضی کی کوئی جھلک تھی نہ ان میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا کوئی مداوا تھا اور نہ ہی مستقبل کے لیے ان میں کوئی

روشنی اور رہنمائی تھی۔ بلکہ یہ قوانین مسلمانوں کے عقاید و عزائم کی عین ضد تھے۔ ان قوانین کے شجرۂ نسب کی ایک اجنبی خاک میں تخم ریزی ہوئی اور اجنبی ماحول میں ہی اسے پروان چڑھایا گیا۔ عجیب بد قسمتی اور سوئے اتفاق ہے کہ اس شجرِ خبیث کو ایسی جگہ لا کر نصب کر دیا گیا ہے جہاں کے رہنے والے مجبور ہیں کہ اس سے نفرت کریں اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کریں۔ یہ قوانین ہمیں کفر و الحاد کی طرف دھکیلتے ہیں اور ہمیں اباحیت اور مادر پدر آزادی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے اصول و فروع کو ہمارے احوال و کوائف سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک بچے کو والدین سے لے کر زبردستی دوسروں کی سرپرستی میں دے دیا جائے یا ماں باپ سے ان کا اپنا بچہ چھین کر کسی ولدالحرام کو ان کی گود میں ڈال دیا جائے۔

قانون عقاید کا ضامن اور محافظ ہوتا ہے

فرد اور جماعت کی مادی ضروریات کے علاوہ اس کے افکار و عقائد وہ عزیز ترین متاع ہیں جن کی حفاظت بذریعہ قانون مقصود ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے افکار و نظریات کا اصل منبع اور سرچشمہ اسلام ہے۔ ہمارے قوانین بنانے والوں کو اگر اللہ تعالیٰ کچھ بھی سمجھ دیتا تو وہ ہر قانون کے بارے میں سب سے

پہلے یہ دیکھئے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں
وہ شعائر و علیہ کے موافق ہے یا مخالف۔ لیکن یہ عجیب حقیقت ہے کہ ہمارا
نرکی اور اب عمال یہ ہے کہ یہ قوانین اسلام کے قوانین کو کھلم کھلا چیلنج
دے رہے ہیں، اسلامی معاشرے کا مذاق اڑا رہے ہیں، اسلامی اصولوں
کی تحقیر کر رہے ہیں اور اسلام کے حقوق و دوجہان کی راہ میں شدت
سے حائل اور مزاحم ہو رہے ہیں۔ اس طرح [illegible] موجودہ
قوانین اصل تدریج قانون کو پامال کر رہے ہیں۔ جس مقصد کے لئے
قانون وضع کیا جاتا ہے اس میں وہ بری طرح ناکام ہو رہے ہیں بلکہ
اپنے وجود و قیام کے لئے وہ اپنے اندر ادنیٰ ترین جواز بھی نہیں
پیدا کر سکتے ہیں۔ اس میں قانون بیچارے کا کیا قصور ہے؟ قصور
ان لوگوں کا ہے جنہوں نے ان قوانین کے نقل کرنے میں کچھ بھی تو
عقل سے کام نہیں لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا امن و سکون غارت
ہوگیا ہے۔ ہمارے گرد و پیش ایک خلفشار اور اضطراب برپا ہے
اور عالم اسلام پر نحوست و شقاوت مسلط ہو رہی ہے۔

قانون کا مقصد خیر کا قیام ہے

قانون کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خیر اور کمال کی طرف
ہماری رہنمائی کرے۔ لیکن یورپ کے قوانین شر اور زوال کی طرف

ہماری رہبری کر رہے ہیں اور ہمیں فساد و ہلاکت کے کھڈ میں گرانا چاہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا بھر کی قوموں کے مقابلے میں مُسلمان خیر کے لیے زیادہ حریص تھے۔ نیکی سے زیادہ قریب تھے اور باہمی تعاون و تراحم پر زیادہ کاربند تھے۔ لیکن جب سے مسلمان ملکوں میں ان بیگانہ قوانین کا چلن ہوا ہے ہم نے رفتہ رفتہ عزت و شرف کا مقام کھو دیا ہے اور ہم اخلاقی فضائل و مکارم سے بالکل عاری ہو گئے ہیں ہمارے اندر خود پسندی، انانیت، مادہ پرستی اور ابن الوقتی عام ہو چکی ہے اور جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز ہمارے درمیان سے اُٹھ چکی ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہماری اخلاقی رفعت کی دُنیا میں مثال دی جاتی تھی اور ایک وقت یہ ہے کہ ہم حیوانات کی طرح اپنی خواہشات کے گرد گھوم رہے ہیں بلکہ درندوں کی مانند شکار کی تلاش میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔

قانون ناجائز انتفاع کو روکتا ہے

قانون کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ناروا نفع اندوزی اور جبری استحصال کو روکے۔ لیکن دیارِ اسلامیہ کے قوانین کا حال یہ ہے کہ وہ گھڑے ہی اس لیے گئے ہیں تاکہ استعماری طاقتوں کے مفادات کی نگہداشت کریں، ان کی لوٹ کھسوٹ کو قانونی شکل دیں، مُسلمانوں کو اقتصادی محکومی میں مبتلا رکھیں اور ذلت و مسکنت کی

گرفت کو کبھی ان پر سے ڈھیلا نہ ہونے دیں۔ سارے عالمِ اسلام کا یہی حال ہے۔ مثال کے طور پر میں اپنے ملک مصر کو لیتا ہوں۔

۱۹۴۵ء میں جب برطانیہ جنگ سے فارغ ہوا تو مصر کا پچاس کروڑ گنی قرضہ اس کے ذمے تھا جسے سٹرلنگ قرضہ جات کا نام دیا جاتا ہے۔ کیا ہمارا ملک اتنا غنی تھا کہ وہ اتنا عظیم الشان قرضہ برطانیہ کو دے سکتا؟ کیا انگلستان نے قرض کے لیے درخواست کی تھی اور مصر نے اسے قبول کیا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں! یہ خالص چوری، لوٹ اور ڈکیتی تھی جسے قانونی ستم ظریفی نے قرضے کا نام دے دیا۔ اسی طرح مصری قوانین نے جلبِ منفعت کی بے شمار ناجائز صورتوں کو انگریزوں کے لیے جائز قرار دے رکھا ہے۔ یہ قانون غریب مصریوں کے منہ سے لقمے نکال کر برطانویوں کے پیٹ کی نذر کر دیتا ہے۔ مصری قانون کی رو سے انگریزوں کے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ وہ ہمارے سٹرلنگ کے بقایاجات میں سے جس قدر چاہیں اپنے تصرف میں لے آئیں۔ ہمارے ہاں "بنک اہلی" کی حیثیت بالکل ایک انگریزی ادارے کی سی ہے۔ انگلستان کے خزانے کے تمسکات کے بالمقابل اس بنک سے مصری کرنسی کا حصول قانونًا جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح سے مصری سرمایہ پر غاصبانہ قبضہ کی ایک قانونی شکل فراہم کر دی گئی ہے۔ برطانوی

ہنڈیوں کے عوض انگریز ہمارے مال و دولت میں سے جو کچھ چاہتے تھے لوٹ لے جاتے تھے۔ کیا اس طرح کا قانون عادلانہ اور منصفانہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کا مقصد یہ ہو کہ ایک قوم کے افراد اپنے پیٹ کاٹ کر دوسری قوم کے تدبر کے لیے ایندھن فراہم کریں؟ ایک قوم کے لوگ تنگدستی میں زندگی بسر کر رہے ہوں اور انہی کے بل پر دوسری قوم کے لوگ داد عیش دے رہے ہوں؟

گزشتہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ہم نے اس گراں بار قرض کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ اگر یہ قرض اب تک واپس مل چکا ہوتا تو اپنی قومی زندگی کے ہر گوشے میں تعمیرِ جدید کا کام شروع کر کے ہم کامیابی کی متعدد منزلیں طے کر چکے ہوتے لیکن ہمارے مطالبات کے جواب میں انگریزوں نے لیت و لعل اور ٹال مٹول کی روش اختیار کر لی۔ انھوں نے ہمارے لیڈروں سے یہ کہنا شروع کیا کہ ہم نے جنگ میں مصر کی حمایت و حفاظت کی تھی، اس لیے ان قرضوں میں تخفیف کی جائے تو کیا ہم نے انگریزوں سے درخواست کی تھی کہ وہ ہماری حفاظت کریں؟ کیا ہم نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی فوجیں یہاں مقیم ہوں؟ کیا ہم نے کسی کے خلاف یا کسی نے ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا؟ افسوس کہ ہماری آنکھیں

اب تک نہیں کھلیں۔ ہم تھے اب تک ان انگریز نواز قوانین کے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہماری زندگی کی ساری ضروریات کو انگریز دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر لیے جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بازار میں سے سبزی ترکاری، پھل اور گوشت بھی پہلے اس کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے اور اس غارت گری کے بعد جو کچھ ہمارے لیے بچ رہتا ہے وہ نہایت قلیل مقدار میں ہوتا ہے اور نہایت گراں قیمت پر ضرورت مندوں کو ملتا ہے صرف اغنیا ہی اس کے خریدنے کی قوت رکھتے ہیں۔ وہی خریدتے ہیں اور عوام حسرت بھری نگاہوں سے انھیں دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح لوہا، لکڑی، سیمنٹ اور دوسرا سامانِ تعمیر برطانوی سپاہیوں کی چھاؤنیوں میں اور ان کے افسروں کے بنگلوں میں کھپ جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کی کوئی قیمت نہیں ادا کی جاتی بلکہ برطانیہ کے خزانے میں ہمارے واجب الوصول قرضوں میں جمع ہوتی رہتی ہے جس کی ادائگی کی نوبت نہ جانے کب آئے گی۔ اس ادائگی کا اگر کبھی وعدہ کر دیا جاتا ہے تو اسے بھی بہت بڑا احسان شمار کیا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس احسان کے بوجھ سے ہماری گردنیں جھک جائیں گی۔ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے قوانین ظلم، غصب اور سلب و نہب کا ایک آلہ ہیں جسے ہمارے دشمن استعمال کر رہے

ہیں اور ہماری حکومت اور قانون کے محافظین کی نگرانی میں یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے ؟

مصری قانون استعمار کا خدمت گزار ہے

قوانین مصریہ سامراجی اور اجنبی مفادات کے پورے پورے خادم اور محافظ ہیں۔ وہ قائم ہی اس بنیاد پر کیے گئے ہیں کہ امپیریلیسٹ طاقتوں کی خدمت بجا لائیں اور انھیں ابنائے مصر کا خون چوسنے کے مواقع فراہم کر کے دیں۔ ان قوانین کی غرض و غایت یہ ہے کہ اہل مصر کو خیر کے رستوں سے ہٹایا اور شر کے رستوں پر بڑھایا جائے۔ انھیں ضعف و جہالت میں مبتلا رکھا جائے اور انھیں سامراج کا تر نوالہ بنایا جائے۔ ہمارے ہاں ریونیو، ٹیکس اور کسٹم سے متعلق جتنے مالیاتی قوانین رائج ہیں وہ مصری مزدور اور کسان کی جیب کو خالی کر کے انگریز سرمایہ دار کی جیب بھرتے ہیں۔ یہ بات بلا مبالغہ اور بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان قوانین کا اولین ہدف یہ ہے کہ برطانیہ کی تجارت کو چمکایا جائے اور مصر کو برطانوی مصنوعات کی منڈی بنایا جائے۔ یہاں درآمد سے متعلق اس طرح کے قوانین موجود ہے جن کی رو سے ماسوا انگلستان کے باقی تمام ممالک کی مصنوعات کا یہاں آنا محال ہو جاتا تھا جن کے ساتھ ارزانی کے لحاظ سے انگلستان

مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم میں سے اکثر کو معلوم ہے کہ جاپان کا تیار کردہ مال محض اس وجہ سے مصر میں نہیں آ سکتا تھا کہ اس پر حد سے زیادہ محصول عائد کیا جاتا تھا ورنہ جاپانی موٹریں، ریڈیو اور دوسری اشیاء انگلستان کے مقابلے میں پانچ گنی سستی ہوتی تھیں۔

مصر کے بے شمار ذرائع و وسائل استعمار کی بقا کے لیے صرف ہو رہے ہیں۔ ہم سڑکیں تیار کرتے ہیں، ریل کی پٹڑیاں بچھاتے ہیں اور انگریز انھیں اپنی عسکری اور تجارتی نقل و حرکت میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم بندرگاہیں تعمیر کرتے ہیں اور انگریزوں کے جہاز ان میں لنگر انداز رہتے ہیں۔ ہم تار اور ٹیلیفون کی لائنیں پھیلاتے ہیں اور انگریز ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ انگریز اور ان کے حلیفوں کے لیے کھانے پینے اور دوسری قسم کا سامان آتا ہے، مصر اسے ڈھونے کی خدمت سرانجام دیتا ہے لیکن ایک پیسہ بھی اس سے نہیں کماتا کیونکہ وہ ہر طرح کے ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہے۔ ہماری گاڑیاں چھکڑے اور حمل و نقل کے ذرائع کی قلیل اور حقیر اجرت اگر از روئے قانون غیر ملکیوں پر عائد ہوتی بھی ہے تو وہ اس کے ادا کرنے میں انتہائی بخل، تنگ ظرفی اور بے اعتنائی سے کام لیتے ہیں اور نہایت لچر عذرات کی بنا پر اسے روکے رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ قانون کی ناک کے نیچے ہوتا ہے، لیکن

قانون خاموش رہتا ہے۔ اجنبی سود خواروں کو قانون کی طرف سے پوری چھوٹ ہے کہ وہ خون آشام جونکوں کی طرح مصر کے غربا کا لہو نچوڑتے رہیں۔ اس طرح مصری غریب سے غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بیرونی مہاجن امیر سے امیر تر بنتے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصر ان حرام خوروں اور قمار بازوں کی چراگاہ بن کر رہ گیا ہے اور وہ ہماری اقتصادی رگ حیات پر پوری طرح قابو پا چکے ہیں۔ بڑے بڑے بنک اور کمپنیاں غیروں کی ہیں، تجارت اور صنعت و حرفت میں جتنا بھی سرمایہ ہے غیروں کا ہے اور درآمد برآمد غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دن نہایت ناپاک اور منحوس تھا جس دن ہمارے ملک میں سودی لین دین کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا۔ مسلمان کے دین میں سودی کاروبار قطعاً حرام ہے۔ مسلمان نہایت مجبوری کی حالت میں سودی قرض لینے کے گناہ کا تو مرتکب ہو جاتا ہے لیکن اگر اسے دین کا کچھ بھی پاس ہو تو وہ سودی قرضہ دینے اور اس پر سود لینے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں سود دینے والے زیادہ تر مصری ہیں اور سود لینے والے غیر مصری۔ اس طرح سے دولت کی یک طرفہ گردش کی وجہ سے تمام مصری سرمایہ غیروں کے ہاتھوں میں جمع ہوتا چلا جا رہا ہے۔

مصر میں شراب اور زنا حلال ہے

سرزمینِ مصر میں شراب کو بھی حلال کر دیا گیا ہے

حالانکہ دینِ اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ جس دن شراب کو حلال کیا گیا تھا اُس دن یہاں سو میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو شراب کے مزے سے آشنا ہو۔ عام مسلمانوں کو معلوم بھی نہ تھا کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ اسی طرح مصر میں سو میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو تحریم خمر کا شاکی ہوتا یا اس کی تحلیل کا مطالبہ کرتا۔ پھر آخر اس ام الخبائث کو حلال کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ کس شے نے ہمارے حکام کو اسلام کے خلاف صریح بغاوت پر مجبور کیا؟ یہ محض اغیار کی خوشنودی اور رضا کی طلب کا مذموم جذبہ تھا۔ ہماری حکومتیں یہ چاہتی تھیں کہ اپنے اوپر سے ایک انتہائی سنگین تہمت کو دفع کریں۔ وہ تہمت یہ تھی کہ مسلمان مذہبی تعصب میں غرق ہیں اور اسلام کے بوسیدہ قوانین کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک میں زنا کو بھی حلال کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہمارے دین نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس فعلِ شنیع کو بھی اس لیے جائز کیا گیا تاکہ دخترِ رز کے ساتھ ساتھ دخترانِ مصر کو بھی غیروں کے سامنے پیش کیا جائے۔ آخر ہماری حکومتیں شراب و شاہد کو اجنبیوں کی خدمت

میں پیش کرنے میں کیوں تحمل سے کام لیتیں جب کہ انھوں نے اپنے سامنے ملکی ذرائع و وسائل اور اموال و اسباب کو لا کر غیروں کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔[1]

شہری آزادیوں سے محرومی

اسی طرح امپیریلسٹ طاقتوں کے اشارے پر بہت سی حکومتیں نقل و حرکت، اجتماع اور تحریر پر پابندیاں عائد کرتی ہیں۔ ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک میں جانے پر چند در چند پابندیاں عائد ہیں جبکہ ایک ہی ملک میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا دشوار ہے۔ مثلاً مصر سے سوڈان جانا یا شمالی سوڈان سے جنوبی سوڈان جانا آسان کام نہیں ہے۔ جلسے جلوس، پریس، مطبوعات اور تنظیمات کی تشکیل کے بارے میں اب تک وہی قانون چل رہے ہیں جو کہ پہلے اجنبی فرمانرواؤں کے مفادات کو سامنے رکھ کر بنائے گئے تھے اور جن کے ذریعے سے قوم کو حریت و مساوات سے محروم کر کے غلامی کے شکنجے میں جکڑ دیا گیا تھا۔[1] اسلحہ کے بارے میں یہاں اس

---

[1] قارئین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ مصری درد ناک داستان پاکستان اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کی داستان سے کس قدر مشابہ تھی۔ (مترجم)

طرح کے قوانین نافذ ہیں جن کی بنا پر اسلحہ کی خرید و فروخت، ان کے رکھنے اور استعمال کرنے پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دی گئی ہیں اس کا مقصد اور نتیجہ سوا اس کے اور کیا ہے کہ ہم نہتّے، کمزور اور اسلحہ کے استعمال سے بے بہرہ رہیں حالانکہ دشمن کے خلاف جہاد کرنا اور اس سے لڑ کر اُسے اپنے وطن سے نکال باہر کرنا ہم پر فرض ہے۔

یہ ہیں وہ اصول فاسدہ جن پر ہمارے قانون کی بنیاد استوار کی گئی ہے اور جن پر اصولِ صالحہ کو قربان کر دیا گیا ہے۔ ان سے ہماری دُنیا بھی بگڑ رہی ہے اور عاقبت بھی خراب ہو رہی ہے۔ ان سے شر، فتنہ اور فساد پروان چڑھ رہا ہے۔ فقر، فاقہ، غلامی اور رسوائی چار سو پھیل رہی ہے۔ یہ ہمارے قوانین نہیں ہیں ہمارے دشمنوں کے قوانین ہیں۔ یہ طوق و سلاسل ہیں جن کی مدد سے اغیار نے ہمیں مقید کر رکھا ہے۔ یہ ہماری کتنی بڑی بدبختی ہے کہ بغیر کسی جائز اور صحیح نسبت کے انھیں ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ یہ قوانین ہمیں کفر و فتنہ کی آغوش میں دھکیل رہے ہیں اور ہماری قومی تباہی اور انتشار کا موجب بن رہے ہیں۔

قانون کو غلبہ و تسلط کب حاصل ہوتا ہے؟

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ معنوی اور حقیقی اعتبار سے قانون ایک ایسی ضرورت ہے جس سے جماعت کو مفر نہیں ہے۔ قانون کے بل پر ہی معاشروں کی تنظیم، مظالم کا انسداد اور حقوق کا تحفظ عمل میں لایا جاتا ہے۔ قانون ہی کی وساطت سے اجتماعی عدل و انصاف کا قیام ممکن ہوتا ہے اور اقوامِ عالم کی رسائی نیرۂ کمال کی منزل تک ہوتی ہے۔ ان اعلیٰ اور اشرف مقاصد کے حصول کی خاطر یہ امر ناگزیر ہوتا ہے کہ قانون کو باقاعدہ اور تحریری متون، دفعات اور الفاظ کے سانچے میں ڈھالا جائے تاکہ روحِ قانون تحریف، انحراف اور نسیان کا شکار نہ ہونے پائے۔ گویا کہ قانونی نظام کے بھی جسمانی نظام کی طرح دو پہلو ہیں: ایک اس کی روح ہے اور ایک اس کا جسم ہے۔ قانون کے اندر جو معنویت کارفرما ہوتی ہے اور جو افرادِ قوم سے اپنے غلبے اور اپنی بالادستی کو تسلیم کراتی ہے وہ درحقیقت روحِ قانون ہے اور الفاظ کا جامہ جو قانون کو پہنایا جاتا ہے وہ گویا کہ جسدِ قانون ہے۔ جس قانونی ڈھانچے کو دل و دماغ پر معنوی اور باطنی غلبہ و اقتدار حاصل نہ ہو وہ ایک مردہ اور بے روح جسم کی مانند ہے۔ تحریری انضباط

اور کاغذ پر لکھے جانے کے باوجود اس قانون کی قدر و قیمت اُس کاغذ کے برابر بھی نہیں جس پر یہ لکھا گیا ہے۔ قانون کی صلاحیتِ افادیت کا اصل انحصار اسی غلبہ و گرفت پر ہے۔ یہ گرفت جتنی قوی ہوگی، قانون بھی اتنا ہی طاقتور ہوگا اور یہ گرفت جتنی کمزور اور ڈھیلی ہوگی، قانون بھی اتنا ہی ضعیف اور بودا ہوگا۔

اس غلبہ و تسلط کو وجود میں لانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے دو اسباب کی کارفرمائی ضروری ہے۔ پہلا سبب خالص روحانی اور اخلاقی نوعیت رکھتا ہے اور یہ قانون کی تقدیس و احترام کا وہ جذبہ ہے جو قانون کی اطاعت کرنے والوں کے قلوب میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس جذبہ کا ہی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قانون کے سامنے سر ہی نہیں بلکہ دل بھی جھک جاتے ہیں۔ جہاں یہ جذبہ موجود ہوتا ہے وہاں قانون کی پیروی مارے باندھے اور کسمساتے ہوئے نہیں کی جاتی بلکہ اس کا استقبال پوری خوش دلی اور نفس کی آمادگی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کو گناہ اور اخلاقی جرم خیال کیا جاتا ہے۔ یہ پسندیدہ صورتِ حال اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک کہ قانون کی بنیاد ایسے عقائد پر نہ رکھی جائے جن پر عوام الناس کا ایمان ہو یا ایسے اصول و مبادی پر نہ رکھی جائے جن کا اکرام و احترام لوگوں کے دلوں

میں موجود ہو۔ قانون کے غلبہ و تسلط کا دوسرا باعث وہ جبر و اکراہ ہے جو نفاذِ قانون کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک خارجی عنصر ہے جو اپنی کارفرمائی کے لیے قانون سازوں اور حکمرانوں کے وجود کا محتاج ہے۔ اس میں وہ سزائیں، تعزیرات اور جرمانے وغیرہ بھی شامل ہیں جو قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں پر عائد کیے جاتے ہیں۔

اقسامِ قانون

قانون کی اقسام

بالادستی اور غلبہ و تسلط کے نقطۂ نظر سے اگر دنیا کے قانونی نظاموں پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں کئی قسم کے مجموعہ ہائے قوانین نظر آتے ہیں۔ ایک قسم کے قوانین وہ ہیں جن کے حق میں باطنی اور ظاہری، روحانی اور مادی دونوں قسم کی بالادستی کے اسباب کام کرتے ہیں۔ قوانین کی یہ قسم اپنے اندر بقا و ارتقا کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے اور معاشرے پر اس کی گرفت نہایت مضبوط ہوتی ہے۔ اس طرح کا قانون چونکہ عوام کے دل کی آواز ہوتا ہے اور ان کے عقاید و نظریات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اس لیے خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ دلوں کی دنیا میں بھی اسی کا سکہ چلتا ہے۔ اس طرح سے ظاہر اور باطن میں کامل یکسانیت

پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قانون بھی ہم سے انہی امور کا تقاضا کرتا ہے جن امور کا تقاضا ہمارے دینی و اخلاقی معتقدات کرتے ہیں۔ خلوت ہو یا جلوت، تنگی ہو یا آسانی، اس طرح کے قوانین کی بہرحال اطاعت کی جاتی ہے اور پورے شرح صدر کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اگر ہم ان قوانین کے مقتضیات کو پورا کرتے ہیں تو ہمیں دلی اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اگر ہم سے ان کی خلاف ورزی سرزد ہوتی ہے تو ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے۔

اس قسم کے قوانین کی بہترین مثال شریعت اسلامی کے قوانین ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ بعض انسان کے وضع کردہ قوانین بھی اس شمار میں آسکتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی قوانین اور خدائی قوانین میں بعض دوسرے بنیادی اختلافات موجود ہیں۔

انسانی قوانین اور الٰہی قوانین

قوانین شریعیہ کا اولین اور مابہ الامتیاز پہلو یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک روحانی برتری اور تقدس کا ایک ایسا عنصر وابستہ ہے جو انسانوں کے وضع کردہ کسی بھی مجموعۂ قانون کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ شریعت کا ہر قانون اسلامی تعلیمات کے کسی نہ کسی گوشے

یا جزئیہ پر مبنی ہے۔ اسلام ہر مسلمان کے لیے واجب قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق، عبادات، آداب، معاملات، تعلقات، غرضیکہ ہر قول و فعل کو خالص اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھالے۔ قوانین شریعت مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور ان کے قلوب بھی اس قانون کی سطوت اور فرمانروائی کی زد میں ہیں۔ انسانی قوانین کا یہ عالم ہے کہ اگر ان میں سے ایک آدھ قانون کی بنیاد دین و اخلاق پر ہو بھی تو اس کے مقابلے میں سینکڑوں قوانین ایسے ہوتے ہیں جن کی بنیاد حکام اور مقننین کی خواہشات و اغراض پر ہوتی ہے۔ یہ امر باخبر حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ یورپ کے سارے قوانین کا اصل ماخذ رومن لا ہے۔ اہل یورپ کے مسیحیت قبول کرنے سے بہت پہلے رومن لا وجود میں آکر اپنی ترقی کے بیشتر مدارج طے کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں جب عیسائیت کو عروج نصیب ہوا تو وہ موسوی شریعت کو ترک کر چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کا کوئی صحیح اور نمایاں اثر قانون پر نہ پڑ سکا۔ البتہ قانون کے ساتھ برائے نام چند ضمیمے شامل کر دیے گئے جن کا حاصل صرف یہ تھا کہ دین کا نام لیا جاتا رہے اور حکومتیں اس کے نام لیواؤں کے لیے کچھ سہولتیں مہیا کرتی رہیں۔

شرعی قوانین کی خصوصیات

قوانین شرعیہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اصل مقصد اخلاقِ فاضلہ کی حمایت و حفاظت ہے۔ شریعت اس مقصد کے لیے اتنا اہتمام کرتی ہے کہ وہ اخلاقی اقدار میں سے ایک ایک قدر کو پامالی سے بچاتی ہے اور جس شے کا ادنیٰ تعلق بھی اخلاقیات سے ہو اس کے معاملہ میں شریعت کا قانون فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ لیکن انسانی قوانین کو اخلاقیات سے کوئی خاص شغف اور دلچسپی نہیں ہے۔ جب تک کسی شخص کی بد اخلاقی کا نمایاں اور محسوس ضرر دوسرے افراد تک متعدی نہیں ہوتا، جب تک "امن عامہ اور نظم حکومت" میں کوئی خلل پڑتا نظر نہیں آتا، اس وقت تک قانون انفرادی اعمال کو خاموش تماشائی بلکہ محافظ بن کر دیکھتا رہتا ہے مثال کے طور پر قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا صرف اسی حالت میں جرم اور قابلِ گرفت و دست اندازی ہے جبکہ طرفین میں سے ایک دوسرے پر جبر کرے۔ گویا کہ اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر و اکراہ ہے۔ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے اسی طرح زبردستی اس کی آبرو پر دست درازی بھی جرم ہے۔ لیکن باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کا مال دوسرے کے لیے جائز ہو جاتا ہے اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے۔ اس باہمی رضامندی کی

کی شکل میں قانون زنا کا حامی اور محافظ بن جاتا ہے اور اگر کوئی تیسرا مداخلت کرکے اس فعل کو روکنا چاہے تو قانون اُسے دھر لیتا ہے۔ لیکن شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے زنا ہر حالت اور ہر صُورت میں حرام اور ناجائز ہے۔ کیونکہ شریعت کی نگاہ میں یہ ایک ایسا جُرم ہے جو اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور جب اخلاق میں فساد رونما ہو جائے تو پوری جماعت میں فساد برپا ہو کر رہتا ہے اور سارے معاشرے کی بنیادیں ڈھے جاتی ہیں۔

اسی طرح قوانینِ موضوعہ کی نگاہ میں شراب نوشی جُرم نہیں ہے اور نہ ہی اس سے پیدا شدہ بدمستی اور مدہوشی قابلِ مواخذہ ہے۔ البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوچ یا ہاتھا پائی کر بیٹھے یا وہ شارعِ عام پر اس طرح جھومتا چلا جا رہا ہو کہ خمار اُس کی حرکات سے بالکل نمایاں ہو، تب کہیں جا کر قانون اس پر ہاتھ ڈالے گا۔ گویا کہ قانونِ موجودہ کی رُو سے فی الحقیقت شراب خوری کا فعل قابلِ گرفت نہیں، بلکہ اصل قابلِ گرفت جُرم فقط دُوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہنچانا ہے۔ شراب کے دُوسرے اخلاقی، مالی اور جسمانی نقصانات جو پینے والے کو اور اُس کے گرد و پیش معاشرے کو پہنچتے ہیں، قانون کو اُن کی روک تھام کی قطعاً فکر نہیں ہے۔ لیکن شریعت مجرد شراب نوشی کو حرام قرار دیتی ہے خواہ اُس سے بدمستی پیدا ہو یا نہ ہو کیونکہ شریعت اس معاملے کو اُس بدامنی

کے ایک محدود نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ اسے نہایت وسیع اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کی نگاہ میں سب سے مقدم اخلاق کی حفاظت ہے۔ یہاں اخلاق کو بنیادی اور ہمہ گیر حیثیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ ان قوانین کا اصل سرچشمہ دین ہے اور دین ہر حالت میں محاسنِ اخلاق کا حکم دیتا ہے اور ایک جماعتِ صالحہ کے قیام کو اپنا اوّلین ہدف قرار دیتا ہے۔ چونکہ دین میں تغیّر و تبدّل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے قوانینِ شریعت کا اخلاق سے رشتہ بھی دائمی اور لاینفک ہے۔

مروّجہ قوانین کی نگاہ میں اخلاق کو کچھ زیادہ اہمیت اس وجہ سے حاصل نہیں ہے کہ ان قوانین میں اگرچہ ایک آدھ قانون ایسا بھی نکل آتا ہے جس کا رابطہ دین سے قائم ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ان قوانین کا دعویٰ، فلسفہ ہی یہی ہے کہ ان کی اساس مخصوص دینی عقائد پر نہیں رکھی گئی بلکہ واقعات، رواجات اور عرفِ عام پر رکھی گئی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے قوانین میں آئے دن ترمیم و اصلاح کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ تغیّر و تبدّل اس طرح کے قوانین کی فطرت میں پیوست ہے۔ عوام یا حکمرانوں یا سوسائٹی کے سربرآوردہ طبقوں کی عادات، ضروریات اور مصلحتیں جب بھی بدلتی ہیں، قوانین بھی ساتھ ساتھ بدل

جاتے ہیں۔ اس طرح کے قوانین بنانے والے اپنے ذاتی احساسات، خواہشات اور بشری کمزوریوں سے بہرحال آزاد نہیں ہو سکتے، دوسری طرف وہ اپنے اعمال کو اخلاقی حدود و قیود کا پابند بھی نہیں کرنا چاہتے چنانچہ ان قوانین میں اخلاقی عنصر کی کارفرمائی روز بروز زائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ان قوانین کے علمبردار فخریہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے قوانین لادینی ہیں، ان کا کسی دین سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس مرحلے پہ قوانین میں اصل قاعدہ و اصول اخلاقی اباحیت اور بے قیدی قرار پاتا ہے، اور اخلاقی پابندیوں کے حامل قوانین استثنا اور شاذ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے بیشتر ضابطے قانون اپنے اس نقطۂ عروج تک پہنچ چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ۔ نیز وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ۔ قوانینِ شریعت کا مصدر اور ماخذ ذاتِ الٰہی ہے۔ اس کے بالمقابل قوانینِ موضوعہ کا سرچشمہ بہرحال انسان کا دماغ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شریعت کے قوانین کا احترام حاکم اور محکوم دونوں دل و جان سے کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقینِ محکم رکھتے ہیں کہ اگر اس قانون کے منشا کو پورا کیا گیا تو دنیا میں بھی سرخروئی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی،

اور اگر اس کی خلاف ورزی کی گئی تو نہ صرف دنیا میں رسوائی ہوگی بلکہ آخرت میں بھی ایسے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے شدید تر کوئی عذاب نہیں ہو سکتا۔ قانون کی کامرانی اور قدروقیمت کا ایک بڑا معیار یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے اندر اس قانون کی اطاعت کا جذبہ کس حد تک ہے۔ اس معیار پر بھی اگر جانچا جائے تو دنیا کا کوئی قانون شرعی قانون کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انسان کے بنائے ہوئے قانون کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نظامِ حکومت اور حکمران افراد کے بدل جانے سے اس طرح کا قانون بہت سے غیر ضروری تغیرات کا شکار ہوتا ہے اور اشخاص کی حرص و ہوا کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے لیکن قوانینِ شرعیہ اس طرح کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک میں یہ طریقہ بالکل عام ہو گیا ہے کہ حزبِ مخالف جب حزبِ حکومت پر تنقید کرتی ہے تو اس کے بنائے ہوئے اور نافذ کیے ہوئے قوانین کو خاص طور پر اعتراض و ملامت کا نشانہ بناتی ہے اور مخالف پارٹی کے افراد ان کے مقابل میں نئے قوانین کا نقشہ پیش کر کے عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم پہلے قوانین کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر نئے اور بہتر قوانین رائج کریں گے۔ حزبِ مخالف کے ارکان ایسا رویہ اختیار کرنے میں اپنے آپ کو بالکل

حق بجانب سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جن قوانین کی ہم مخالفت کر رہے ہیں اور جن کی تنسیخ کا ہم عزم رکھتے ہیں وہ بھی خطاکار انسانوں ہی کی ذہنی تراوش ہیں۔ مغرب کے اکثر ممالک میں قانون کی عظمت و سطوت مضمحل ہوتی چلی جا رہی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں اس کی قدر و قیمت بالکل زائل ہو کر رہ جائے۔

جن قوانین کی بنا محض مصلحت اور منفعت پر رکھی جاتی ہے انہیں ایسا فرد اور جماعت کا دائمی احترام کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک افراد یا جماعتیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ قوانین ان کے مصالح کا ساتھ دے رہے ہیں وہ قوانین کے سامنے سر جھکاتے ہیں لیکن ان قوانین کی زد جب ان کے مفاد پر پڑنے لگتی ہے تو ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا جاتا ہے۔ آج کل کے بیشتر قوانینِ عالم کا یہ حال ہے کہ ان کا رشتہ دین، عقائد، اخلاق اور فضائلِ انسانی سے منقطع ہو چکا ہے۔

شریعت پر عدمِ صلاحیت کا الزام

شریعت کے مطالعہ سے مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ جو لوگ شریعت کو موجودہ دور کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے ناقابل سمجھتے ہیں ان کی یہ باتیں محض بے سروپا ہیں۔ ان

کی یہ رائے کسی علمی مطالعہ اور منطقی استدلال پر مبنی نہیں۔ اس لیے کہ علم و منطق دونوں کے اعتبار سے اسلامی شریعت قوانین موضوعہ سے برتر و بہتر قرار پاتی ہے اور اسے صرف دورِ حاضر ہی نہیں بلکہ تمام آنے والے ادوار کے حالات اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل کہا جا سکتا ہے۔

شریعت پر عدمِ صلاحیت کا الزام لگانے والوں کے دو گروہ ہیں ایک گروہ وہ ہے جس نے نہ شریعت کا مطالعہ کیا نہ قانون کا۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے قانون کا مطالعہ تو کیا ہے لیکن شریعت کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ گویا یہ دونوں کے دونوں گروہ شریعت اور اس کے احکام سے یکسر بے بہرہ ہیں۔ اس جہل کے ہوتے ہوئے وہ اس کے قطعاً اہل نہیں کہ اس پر کوئی حکم لگائیں اور اس کے بارے میں کوئی فیصلہ دیں۔ کسی چیز سے ناواقف رہ کر اس پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان شریعت کے نہ جاننے والوں نے اپنے اس غلط خیال کی بنیاد ایک غلط قیاس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ باضابطہ مطالعہ و تحقیق سے ان کی یہ رائے قائم ہوئی ہو۔ انھوں نے جانا کہ موجودہ دور کے قوانین، اٹھارھویں صدی عیسوی بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے قوانین سے بھی بالکل مختلف ہیں۔ ان میں باہم کوئی مناسبت

ہی نہیں ۔ انھوں نے یہ بھی جانا کہ موجودہ قوانین ان فلسفیانہ نظریات اور انسانیت و اجتماعیات کے ان بنیادی تصورات پر قائم ہیں، جن کا قدیم قوانین میں کوئی وجود ہی نہ تھا۔ قانون کی ان دو انواع کے تقابلی مطالعہ سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا اور رائے قائم کی کہ قدیم قوانین موجودہ دور کے لیے غیر موزوں ہیں ۔ اس رائے کے برحق اور صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ۔ لیکن اس کے بعد جب وہ اسلامی شریعت پر قوانینِ موضوعہ کو قیاس کرتے ہیں تو یہیں وہ سخت ٹھوکر کھاتے ہیں اور حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں ۔ ان کی منطق یہ ہوتی ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک کے قوانین جب موجودہ دور کے ناقابل ہیں تو یہی حال شریعت کا بھی ہے ۔ اس لیے کہ شریعت ازمنۂ وسطیٰ کی چیز ہے اور اس کے بعض احکام زیادہ سے زیادہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک جاری رہے ہیں ۔ یہ غلط قیاس اور اُلٹی منطق ہی ان کی ایسی کھلی ہوئی اور فاش غلطی ہے کہ کوئی سمجھ دار ناقد اس پر گرفت کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

شریعت پر وضعی قانون کو قیاس کرنے کی غلطی

اس قیاس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے قوانینِ موضوعہ اور شریعت کو ایک حیثیت دے

دی - حالانکہ قوانینِ موضوعہ انسانی دماغ کی پیداوار ہیں اور شریعت کے وضع کرنے کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے - ان کا یہ قیاس کرنا گویا زمین کو آسمان کا یا خالق کو مخلوق کا مدِ مقابل ٹھہرانا ہے - ایک سمجھ دار انسان کے لیے کم از کم یہ قابلِ قبول بات نہیں ہو گی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے رب پر اور اپنی زمین کو آسمان پر قیاس کرنے لگے -

انھوں نے شریعت اور قانون کو ایک دوسرے پر قیاس کیا حالانکہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ایک کو دوسرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں - آگے چل کر ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ہر ایک کی نشو و نما کن حالات میں ہوئی اور ان کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں جو ایک کو دوسرے سے ممیز کرتی ہیں تو اس اختلاف کی حدود واضح ہوں گی -

لا قیاس بین المختلفین
(دو مختلف امور کے درمیان قیاس ممکن نہیں)

جب یہ طے پایا کہ شریعت قوانینِ موضوعہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور چند جوہری خصوصیات ہیں جو اسے اُس سے ممیز کرتی ہیں تو ان کے درمیان قیاس ناممکن قرار پاتا ہے، اس لیے کہ قیاس بلحاظ قاعدہ مقیس اور مقیس علیہ کی مساوات کا مقتضی ہے - مساوات نہ ہو تو قیاس بھی ممکن نہیں اور اگر کیا جائے تو باطل قرار پائے گا -

شریعت کو موجودہ دور کے ناقابل قرار دینے والوں نے چونکہ

اس کو قوانینِ موضوعہ پر قیاس کرکے یہ رائے قائم کی ہے، درآں حالیکہ شریعت اور قوانین میں مساوات نہیں، اس لیے ان کا یہ قیاس بھی باطل اور اس باطل قیاس پر مبنی ادعا بھی باطل۔ ما قام علی الباطل فھو باطل (جو باطل پر قائم ہو وہ بھی باطل)۔

آئندہ سطور میں ہم قانون اور شریعت کی نشوونما کے حالات، ان کے اختلافات اور خصوصیات کی وضاحت کریں گے۔ جس سے ان کا باہمی فرق اچھی طرح معلوم ہو سکے گا اور جو ان میں فرق نہیں کر پاتے وہ اس کی حقیقت سمجھ سکیں گے اور یہ بات سامنے آئے گی کہ شریعت قانون سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور چند جوہری خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ اس سے ممتاز ہو جاتی ہے۔

انسانی قانون کی نشوونما

قانونِ موضوعہ، انتہائی معمولی حیثیت سے اور محدود اصول و قواعد کے ساتھ اس جماعت میں پیدا ہوتا ہے جو اسے بناتی اور منظم کرتی ہے۔ پھر جیسے جیسے جماعت کی ضروریات بڑھتی اور متنوع ہوتی جاتی ہیں اور علوم و آداب اور فکر و تحقیق میں ترقی ہوتی ہے، قانون میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نئے نئے اصول و قواعد بنتے ہیں اور نظریات و تصورات میں خوبی اور پختگی کی شان آتی جاتی ہے۔ گویا قانونِ موضوعہ

کی مثال ایک بچے کی سی ہوتی ہے جو چھوٹا اور کمزور سا پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ قوت پاتا اور بڑا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پورے شباب کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر قانونِ موضوعہ کی اس ترقی کی رفتار اس جماعت کے تابع ہوتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر جماعت میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہیں اور وہ جلد جلد ترقی کی طرف قدم بڑھائے تو قانون بھی اسی اعتبار سے جلدی ہی ترقی کے منازل طے کرے گا۔ اور اگر جماعت میں ترقی و تبدیلی کی رفتار سست ہو تو یہی حال قانون کا بھی ہو گا۔ اس طرح قانونِ موضوعہ اپنی تخلیق میں جماعت کا رہینِ کرم ہوتا ہے اور جماعت اسے اپنی ضروریات کے تقاضوں کے اعتبار سے وضع کرتی ہے۔ قانون' اس کی زندگی، ترقی اور تبدیلی سب جماعت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔

علماءِ قانون کا، قانون کی ابتدا اور نشو و نما کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ انسانی اجتماعیت کی بالکل ابتدائی صورت یعنی خاندانی اور قبیلوی زندگی کے آغاز ہی سے اس کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ صدرِ خاندان یا سردارِ قبیلہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ہی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد انسان کی جماعتی زندگی میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ قانون میں بھی تبدیلیاں ہوتی

گئیں یہاں تک کہ ریاست وجود میں آئی۔ چونکہ ایک ریاست کے حدود میں واقع تمام قبیلوں اور خاندانوں کے عادات اور رسوم درواج ایک جیسے نہیں ہُوا کرتے تھے۔ اس لیے ریاست نے ان عادات و رسوم کی کاٹ چھانٹ کر کے تمام قبیلوں اور خاندانوں کے لیے ایک ہی واجبُ الاتباع قانون بنایا لیکن ترقی کے اس قدم کے باوجود ایک ریاست کا قانون دوسری ریاستوں کے قانون سے بہت مختلف ہُوا کرتا تھا اٹھارھویں صدی عیسوی کے ختم تک بھی یہ اختلافات اسی طرح باقی رہے۔ اس کے بعد سے قانون میں کچھ نئی تبدیلیاں شروع ہوئیں اور جدید فلسفیانہ نظریات اور علمی و اجتماعی تصورات کی روشنی میں اس کی ترقی کے آخری مرحلے کا آغاز ہُوا۔ اس آخری مرحلے میں قانون میں چند بنیادی اور عظیم الشّان تبدیلیاں ہوئیں اور ایسے جدید نظریات پر اس کی اٹھان ہُوئی کہ جن کا گزشتہ زمانے میں وجود ہی نہ تھا۔ انصاف، مساوات، ہمدردی اور انسانیت اِن جدید نظریات کے دُنیا میں پھیلنے کی وجہ سے دُنیا کی بیشتر ریاستوں کے قانونی اصول بڑی حد تک ایک جیسے ہو گئے ہیں۔ تاہم تفصیلات اور جزئیات میں ابھی اختلافات موجود ہیں۔

یہ قانون کی نشوونما اور اس کے عہد بہ عہد تبدیلیوں کا ایک مختصر سا خلاصہ ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قانون اپنی ابتدا میں موجودہ

صورت سے بالکل مختلف تھا۔ مختلف تغیرات اور تبدیلیوں کے بعد یہ اس موجودہ شکل میں پہنچا ہے اور یہ تبدیلیاں بھی بہت ہی آہستہ اور ہزاروں سال میں چل کر ہوئی ہیں۔

شریعت کی نشو و نما یہ تو ہوا قانونِ موضوعہ کا حال، لیکن شریعت کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ نہ اس کی تخلیق اس طرح ہوئی، نہ اس کی نشو و نما کا یہ حال ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ ابتدائی حالت میں شریعت چند مختصر سے قواعد، متفرق و منتشر اصول اور ابتدائی اور نامکمل نظریات کا نام رہا ہو۔ پھر اس کے بعد ان میں تنظیم اور پختگی پیدا ہوئی ہو۔ اس کی تخلیق ایک بچے کی حیثیت سے نہیں ہوئی کہ آہستہ آہستہ اس میں تبدیلیاں ہوتیں اور درجہ بدرجہ یہ ترقی کرتی جاتی بلکہ وہ تو اپنے یومِ پیدایش ہی سے پورے شباب کو پہنچی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر قسم کی کجی اور نقص سے پاک، کامل، ہمہ گیر اور جامع و مانع صورت میں اتارا۔ ایک محدود و معین مدت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اسے القا فرمایا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس کی ابتدا ہوئی اور آپ کی وفات پر یا اس آخری وحی پر اس کا اختتام ہوا جب کہ اللہ نے اعلان فرمایا: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

شریعت کسی ایک جماعت' ایک قوم' یا ایک سلطنت ہی کے لیے نہیں آئی بلکہ اس کا پیغام یکساں طور پر تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ عربی و عجمی' مشرقی و مغربی ہر کسی سے وہ خطاب کرتی ہے۔ خواہ ان کے رسوم رواج اور تاریخی حالات میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ پس شریعت ہر خاندان کی' ہر قبیلہ کی' ہر جماعت کی اور ہر سلطنت کی شریعت ہے۔ بلکہ وہ عالمی شریعت اور جہانی قانون ہے جس کا علماء قانون تصور تو کر سکتے ہیں لیکن جسے وجود میں لا نہیں سکتے۔

شریعت کمال کے اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں۔ ایسی جامع ہے کہ ہر صورتِ حال کا اس میں حل موجود ہے۔ ایسی مانع ہے کہ کوئی حالت اس سے خارج نہیں۔ وہ تمام امور کو محیط ہے' خواہ وہ امور افراد سے متعلق ہوں یا جماعتوں اور سلطنتوں سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ وہ نظمِ حکومت اور سیاست اور اسی طرح جماعت سے متعلق تمام امور کی تنظیم کرتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر حالت امن و جنگ میں حکومتوں کے باہمی تعلقات کے لیے بھی اس کے متعین اصول و قوانین ہیں۔

شریعت کسی ایک زمانے یا عہد کے لیے بھی مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر زمانے اور ہر عہد کے لیے ہے اور تا قیامِ قیامت ہر دور میں

کارآمد ہے۔ شریعت کچھ اس طرز پر ڈھالی گئی ہے کہ امتدادِ زمانہ کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، نہ اس کے نئے پن میں کوئی فرق آ سکتا ہے؛ نہ اس کے قواعدِ عامہ پر اور نظریاتِ اساسی میں کسی تغیّر کی ضرورت ہے اس کی نصوص کچھ ایسی عمومیّت اور لچک اپنے اندر رکھتی ہیں کہ ہر نئی صورتِ حال کے بارے میں وہ فیصلہ دے سکتی ہیں؛ خواہ بحالتِ وجود اس صورت کے پیدا ہونے کا امکان بھی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کی نصوص میں کسی تغیّر و تبدّل کی گنجائش نہیں۔ وہ ایسی ادلتی بدلتی نہیں رہتیں جیسی کہ قوانینِ موضوعہ کی نصوص ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔

شریعت اور قانون کے درمیان اس فرق کی بنیاد یہ ہے کہ شریعت اس اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے ہے جس کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں لا تبدیل لکلمات اللہ (یونس : ٦٤)۔ وہ غیب کا جاننے والا اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اس کے علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں کہ لوگوں کو ہر زمانے میں کام آنے والے نصوص و احکام دے۔ اس کے برخلاف قوانینِ موضوعہ انسان کی اپنی اُپج ہے انسان اپنی وقتی ضروریات کے اعتبار سے انھیں مرتّب کرتا ہے۔ آنے والے حالات کا اسے علم نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اس کی مرتّب کردہ نصوصِ قانونی ان حالات کا احاطہ کیے ہوئے نہیں ہوتیں جن کا بحالتِ

موجودہ اگرچہ کوئی امکان نہیں ہوتا لیکن آئندہ پیش آ سکتے ہیں۔

شریعت ابتدا ہی سے ان جدید ترین نظریات کی حامل ہے جن تک اب کہیں چل کر قوانینِ موضوعہ کی رسائی ہوئی ہے۔ حالانکہ قانون اپنی عمر کے اعتبار سے زیادہ پرانا ہے۔ بلکہ شریعت اپنے دامن میں مختلف ایسے اصولوں اور نظریات کے جواہر ریزے بھی رکھتی ہے جن تک ابھی ہمارے قانون سازوں کا تصور بھی نہیں گیا۔ ہمارے اربابِ قانون جس قسم کے اصول چاہتے ہیں اور جن کے قوانین میں موجود ہونے کی انھیں بس تمنا ہی ہے، وہ سب ابتدا ہی سے شریعت میں موجود ہیں۔

شرعی اور وضعی قانون میں کوئی مماثلت نہیں

شریعت اور مروج قانون کی نشو و نما کے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریعت اور قانون میں کوئی مماثلت نہیں، نہ ان میں کسی درجہ کی مساوات ہے، نہ ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ شریعت کا مزاج کلی طور پر قانون سے مختلف ہے اور ان میں باہم کوئی مناسبت ہی نہیں۔ اگر شریعت کا مزاج قوانینِ موضوعہ کا سا ہوتا، تو ہم اسے موجودہ صورت سے بالکل مختلف پاتے۔ ایسی صورت میں چند ابتدائی نامکمل نظریات کی حیثیت سے اس کا آغاز ہوتا۔ اس کے بعد جوں جوں سوسائٹی میں تبدیلیاں اور

ترقیاں ہوتی جاتیں، یہ بھی قانون کی طرح بدلتی اور ترقی کے منازل طے کرتی جاتی۔ اس کا دامن ان نئے نئے اصول و نظریات کے جواہر ریزہ دل سے خالی ہوتا جن سے وہ اب مالا مال ہے اور جن کی بدولت وہ قوانینِ موضوعہ کے مقابلے میں سربلند ہے بلکہ ہوتا یہ کہ قوانینِ موضوعہ کے ان نظریات کو جاننے اور ان اصولوں کو اپنانے کے بعد ہزاروں سال میں چل کر کہیں وہ ان کی ہم سطح ہو سکتی۔

شریعت اور قانون کے بارے میں ان تاریخی توضیحات سے، ان کے باہمی اختلافات اور ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنے والی خصوصیات آپ سے آپ ذہن میں آسکتی ہیں۔ قارئین کے لیے ان کا جاننا چنداں مشکل نہیں۔ تاہم میں یہاں چند بنیادی اختلافات اور جوہری خصوصیات کی وضاحت کروں گا، جس کے بعد جزئی امور پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

شریعت اور قانون کے بنیادی اختلافات

اسلامی شریعت قوانینِ موضوعہ سے بنیادی طور پر دو امور میں مختلف ہے:۔

(۱) قانون انسان کا بنایا ہوا ہے اور شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ۔ اور دونوں میں ان کے بنانے والوں کی صفات کا عکس

دیکھا جا سکتا ہے۔ قانون انسان کا بنایا ہوا ہونے کی وجہ سے انسان کی کمزوری، عاجزی اور بے چارگی کا آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ادلتا بدلتا اور تغیر و تبدل کا شکار رہتا ہے۔ جب کبھی سوسائٹی میں غیر متوقع تبدیلی ہو جائے حالات پیدا ہو جائیں تو اسی اعتبار سے قانون بھی بدلتا ہے۔ پس قانون کی فطرت ہی میں نقص ہے۔ جب تک اس کے بنانے والے ہی میں کمال کی صفت نہ پیدا ہو اور وہ تمام ہونے والے واقعات و حالات کا احاطہ نہ کر سکے یہ بھی کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے برخلاف شریعت اللہ جل شانہٗ کی صنعت ہے اور صانع کی قدرت و عظمت اس کے کمال اور احاطۂ علم پر شاہد۔ جس طرح خدا علیم و خبیر کا علم ہر شے کو محیط ہے اسی طرح اس کی شریعت بھی موجودہ و آئندہ کے تمام حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس میں کسی تغیر و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ جیسا کہ فرمایا: لا تبدیل لکلمات اللہ (یونس: ۶۴) اس لیے کہ خواہ زمان و مکان کے کتنے ہی تغیرات ہوں اور خود انسانوں ہی میں تبدیلیاں کیوں نہ ہو جائیں، اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوگی۔

بعض ایسے لوگوں کے لیے جو اللہ کی طرف سے ہونے ہی کو تسلیم نہیں کرتے، اس کا ماننا مشکل ہے۔ ان کے اطمینان کی یہ صورت

ہوسکتی ہے کہ شریعت کی جن صفات کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان کی حقیقت جان لیں۔ پھر شریعت میں ان صفات کے موجود ہونے پر ان کے سامنے دلائل رکھے جائیں گے۔ اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو غور کرلیں کہ دوسرے قوانین کے برخلاف شریعت میں ان خصوصیات کے موجود ہونے کا آخر کیا سبب ہوسکتا ہے اور ان خصوصیات کی حامل شریعت آخر کس صانع کے دستِ صنعت کا کمال ہے۔ آگے چل کر جب شریعت کی خصوصیات پر بحث ہوگی تو ان کے سامنے یہ دلائل رکھے جائیں گے۔ یوں اگر وہ غور کرلیں تو اس کتاب کی ہر فصل میں اس کے لیے دلائل ہیں۔

جو لوگ شریعت کے اللہ کی طرف سے ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے لیے البتہ ان صفات و خصوصیات کا ماننا کچھ مشکل نہیں۔ انھیں اس کے لیے کسی مادی دلیل کی بھی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ یہ تو ان کے ایمان و تسلیم کا منطقی تقاضا ہے۔ اگر کوئی اس حقیقت پر ایمان لاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ سورج اور چاند ستارے بنائے۔ پہاڑوں، ہواؤں اور سمندروں کو مسخر کیا۔ نباتات اگائے۔ ماؤں کے پیٹ میں جنین کی تخلیق کی، تمام مخلوقات کو ایک نظام کا پابند بنایا جس سے دوسر تابی نہیں کرسکتے اور جس میں کسی تغیر و

تبدل کی گنجائش نہیں، تو اس کے لیے یہ تسلیم کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند ایسے ناقابلِ تغیر قوانین بنا دیے ہیں جو تمام اشیا پر حاوی ہیں۔ اور یہ قوانین کمال کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہیں جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسے یہ بھی تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہر چیز میں پورا کمال اور سلجھاؤ ہے، وہ بدرجۂ اولیٰ اس حقیقت پر ایمان لائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے شریعتِ اسلامیہ کو افراد، جماعتوں اور حکومتوں کی تنظیم کے لیے ایک ناقابلِ تغیر کامل و مکمل قانون کی حیثیت سے وضع فرمایا تاکہ ان کے معاملات اس کی روشنی میں فیصل ہوں اور ان کی زندگی سنور جائے اور یہ شریعت کمال کے اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی ان ساری چیزوں کے ماننے کے باوجود محض اپنے اطمینانِ قلب کے لیے ان پر دلیل چاہتا ہے تو آگے اپنے مقام پر اس کی تشفی ہو جائے گی۔

(۳) قانونِ موضوعہ ایسے وقتی قواعد سے عبارت ہے جنہیں جماعت اپنی فوری معاملات کی تنظیم اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے وضع کرتی ہے۔ پس قانون ایسے قواعد کا نام ہے جو سوسائٹی سے متاخر ہوتے ہیں۔ یعنی یہ قواعد اگر آج کی سوسائٹی کی سطح سے مطابقت رکھتے ہیں تو کل یہی

سوسائٹی کے حالات سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ قوانین اس تیزی سے نہیں بدل سکتے جس تیزی سے کہ سوسائٹی میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ قوانین موضوعہ سوسائٹی کے وقتی حالات سے تعلق رکھنے والے وقتی قواعد ہوتے ہیں اور جب کبھی سوسائٹی کے حالات بدل جائیں، ان میں تغیر ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اس کے برخلاف شریعت ان قواعد کا نام ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے سوسائٹی کے معاملات کی تنظیم کی غرض سے وضع فرمایا ہے اور یہ قواعد ہمیشہ باقی رہنے اور کام دینے والے ہیں۔ قانون اور شریعت میں اس حد تک تو اتفاق ہے کہ دونوں کا مقصد سوسائٹی کی تنظیم ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر ان میں عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ اگر قانون وقتی اور ہنگامی چیز ہے تو اس کے برخلاف شریعت کے اصول دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ شریعت کی یہ خصوصیت منطقی طور پر اس بات کی مقتضی ہے کہ :-

(۱) شریعت کے قواعد ایسی عمومیت اور لچک اپنے اندر رکھیں کہ خواہ کتنا ہی زمانہ گزر جائے سوسائٹی میں کتنی ہی تبدیلیاں ہوں اور ضروریات کتنی ہی متنوع اور متعدد ہو جائیں، یہ ہمیشہ کارآمد رہیں اور سوسائٹی کے تقاضوں کو پورا کریں۔

(۲) شریعت کے قواعد اور نصوص بلندی کی اس شان کو پہنچے ہوئے ہوں کہ کسی زمانے اور کسی دور میں سوسائٹی کے حالات اور سطح سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

یہ جو کچھ از روئے منطق ہونا چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ واقع میں بھی موجود ہے، بلکہ شریعت اسلامیہ کی یہی وہ اہم خصوصیت ہے جو اسے تمام آسمانی شرائع اور انسانی قوانین سے ممتاز کرتی ہے۔ شریعت اسلامیہ کے نصوص و قواعد عموم کی حد کو پہنچے ہوئے ہیں اور ان میں غایت درجہ لچک ہے۔ اس کے علاوہ ان میں ایسی بلندی و رفعت ہے کہ اس سے آگے بلندی کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔

شریعت اسلامیہ پر تیرہ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا۔ اس عرصہ میں کتنی ہی مرتبہ سوسائٹی کی تشکیلات بدلیں، افکار و آراء میں تبدیلیاں ہوئیں، نئے نئے علوم پیدا ہوئے اور ایسی ایسی ایجادات ہوئیں جن کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ قوانین موضوعہ کے قواعد اور نصوص میں کتنے ہی تغیرات ہو گئے تاکہ انھیں جدید حالات اور اس کے تقاضوں کے مطابق بنایا جا سکے، یہاں تک کہ شریعت کے زمانہ نزول کے قوانین اور آج کے قوانین میں کوئی مناسبت ہی نہ رہی۔ باوجود ان سارے حالات کے اور باوصف اس حقیقت

لیے کہ شریعت میں نہ کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، آج بھی اس کے نصوص و قواعد سوسائٹی کی سطح سے کہیں بلند، اس کے معاملات کی تنظیم اور ضروریات کی تکمیل کے زیادہ بہتر کفیل، انسانی طبائع سے زیادہ قریبی مناسبت رکھنے والے اور دنیا کے امن و اطمینان کے زیادہ بہتر ضامن ہیں۔

اسلامی شریعت کی تائید میں یہ تاریخ کی ایک روشن شہادت ہے۔ اس سے زیادہ واضح ثبوت درکار ہو تو خود نصوص شریعت ہی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)۔ "وہ کام کرتے ہیں آپس کے مشورہ سے۔"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لا ضرر و لا ضرار فی الإسلام۔

قرآن اور سنت کی یہ نصوص غور کیا جائے تو پوری عمومیت اور سہولت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اور ایسی لچک ان میں ہے کہ ہر زمانہ اور ہر حال میں کارآمد ہیں۔ ان نصوص کے اعتبار سے "شوریٰ" کا اصول حکومت کا بنیادی قاعدہ قرار دیا گیا ہے۔ اور اس اصول کی مزید

توضیح یہ کی گئی ہے کہ اس سے نہ عام نظامِ حکومت کو نقصان پہنچے نہ افراد اور جماعتوں کے مصالح متاثر ہوں۔ شوریٰ کا یہ اصول اور اس کے یہ شرائط شریعت کی رفعت و بلندی کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت ہیں۔ ناممکن ہے کہ انسانی دماغ کبھی کسی دور میں بھی اس بلندی تک پہنچ سکے۔

اگر ہم شریعت کی ایک ایک نص کا جائزہ لیں تو ساری ہی نصوص ایسی ہونگی جو عمومیت اور بلندی و رفعت کی شان اپنے اندر رکھتی ہیں جو بھی نص ہمارے سامنے پیش ہو، سب میں ہی ہم یہ خصوصیات پا سکیں گے اور ساری نصوص اس سلسلے میں مثال کا کام دے سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ایک اور ارشاد پر بھی اسی حیثیت سے غور کیجیے۔ ارشادِ ربانی ہوتا ہے:

أُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔ (النحل: ۱۲۵) "بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح، اور الزام دے ان کو جس طرح بہتر ہو۔"

غور کیجیے کہ اس میں کتنی عمومیت اور لچک اور کیسی دوام کی شان ہے۔ دعوت کے لیے جو اصول اور طریق کار اس میں بتایا گیا ہے، کیا اس سے بہتر کسی اصول کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ کیا عقلِ انسانی

حکمت، موعظۂ حسنہ اور مجادلہ بطریقِ احسن سے زیادہ بہتر اصول بھی دے سکتی ہے؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات پر بھی ایک نگاہ ڈالیئے:

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر: ۱۸) "اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا۔"

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ: ۲۸۶) "اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے۔"

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل: ۹۰) "اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے۔"

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (النساء: ۵۸)۔ "بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے۔"

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا

هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدۃ : ۸) "کسی قوم کی دشمنی تم کو مجرم نہ بنا دے کہ تم انصاف نہ کر سکو۔ انصاف کرو، کیونکہ یہ تقوٰی سے قریب تر ہے۔"

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء: ۱۳۵)۔

"اے ایمان والو قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف کی، اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا۔"

مذکورہ نصوص بلکہ شریعت کی ساری ہی نصوص کو بنظر غائر دیکھ جائیے اور دیکھیے کہ ان میں عموم اور ہر حال میں کار آمد ہونے کی کیسی شان جھلک رہی ہے۔ جو اصول و مبادی کہ ان میں پیش کیے گئے ہیں، ان میں ایسی بلندی اور رفعت ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) قانون کو بنانے والی سوسائٹی ہوتی ہے اور وہ اپنے عادات، رسوم اور تاریخی پس منظر سے اس میں رنگ آمیزی کرتی ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے معاملات کی تنظیم کے لیے بنایا جاتا ہے۔ سوسائٹی کی رہنمائی اور توجیہہ اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ اس طرح قانون سوسائٹی سے مؤخر اور اس کے تغیرات اور تبدیلیوں کا تابع ہوتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں قانون سوسائٹی کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ سوسائٹی قانون کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔

ابتدائے قانون کی یہی اصل تھی۔ لیکن ابھی اس صدی میں یا زیادہ متعین طور پر کہا جائے تو پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے اس میں تبدیلی ہو گئی ہے اور ان حکومتوں نے جو خاص خاص تحریکوں کی علم بردار تھیں اور دنیا نظام دنیا کے سامنے پیش کر رہی تھیں، قانون سے عوام کی رہنمائی کا بھی کام لیا اور اپنے مخصوص اغراض کی تکمیل کے لیے اسے آلۂ کار بنایا۔ اس سلسلے میں پہل کمیونسٹ روس اور مصطفیٰ کمال کے ترکی نے کی۔ اس کے بعد فاشی اٹلی اور نازی جرمنی نے اسے درجۂ کمال تک پہنچایا۔ پھر دوسری حکومتوں نے بھی اسے اپنایا۔ چنانچہ اب قانون کی غرض سوسائٹی کی تنظیم کے علاوہ اربابِ اقتدار کے حسبِ منشاء عوام کی رہنمائی اور توجیہ بھی ہے۔

لیکن جہاں تک شریعت کا تعلق ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ سوسائٹی کی پیدا کردہ نہیں۔ نہ سوسائٹی کی تبدیلیوں اور تغیرات کا نتیجہ ہوتی ہے، جیسا کہ قوانینِ موضوعہ کا حال ہے بلکہ یہ اس اللہ تعالیٰ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز پوری خوبی سے بنائی ہے۔ پھر شریعت صرف سوسائٹی کے معاملات کی تنظیم ہی کے لیے وضع نہیں ہوئی جیسا کہ قانونِ موضوعہ کا

حال تھا۔ بلکہ شریعت کا مقصودِ اوّلین تو صالح افراد اور صالح جماعت
کا پیدا کرنا اور ایک مثالی حکومت اور مثالی دنیا کا وجود میں لانا رہا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اس کی نصوص اپنے زمانۂ نزول کی دنیا اور اس کی سطح سے
بلند و برتر تھیں بلکہ موجودہ دنیا کی سطح سے بھی کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں۔
ان نصوص میں ایسے اصول و نظریات پیش کیے گئے ہیں جن تک غیر
اسلامی دنیا صدیوں بعد چل کر پہنچ سکی ہے۔ بلکہ بہت سے نظریات ایسے
ہیں جن تک دنیا کا دماغ آج تک نہیں پہنچ سکا۔ شریعت کی اس شان
کا تقاضا تھا کہ خود اللہ تعالیٰ اس کے وضع کرنے کی ذمہ داری لیتا چنانچہ
اس نے پوری شانِ کمال کے ساتھ اسے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم
پر اُتارا۔ اور رسول کا یہ فریضہ قرار پایا کہ وہ لوگوں کو طاعات و فضائل
کی باتیں بتائیں اور بلندی و کمال کے اس درجہ تک پہنچائیں جو شریعت
کا مطلوب ہے۔ شریعت نے اپنا یہ مشن باحسن الوجوہ پورا کر دیا اور
خدائے علیم و خبیر کے منشا کی تکمیل کر دی۔ اس نے ریگزار عرب کے
شتربانوں کو دنیا کی پیشوائی اور سیادت کے مقام پر پہنچا دیا اور ان
میں [illegible] انسانیت کا [illegible] گئے
تھے۔

مسلمان جب تک شریعت پر عامل رہے، شریعت نے انھیں

برابر بہ فرات دیے۔ شریعت کو اپنا اصولِ عمل بنا کر وہ ہمیشہ کامیابیوں سے ہمکنار رہے۔ دورِ اوّل کے مسلمانوں نے اسے اپنایا جو بظاہر قلیل التعداد کمزور اور ہر وقت اس اندیشہ میں گھرے تھے کہ کہیں دُوسری قوموں کے دستِ تعدّی کا شکار نہ ہو جائیں وہ بیس سال کے قلیل عرصے میں اِن پستیوں سے بلند ہو کر ساری دُنیا کے امام و پیشوا اور انسانیت کے ہادی و رہنما ہو گئے۔ یا تو پستی و گمنامی کا یہ عالم تھا کہ اقوامِ عالم میں ان کا کوئی مقام ہی نہ تھا یا یہ حال ہو گیا کہ ہر طرف انہی کا بول بالا تھا اور چار دانگ عالم میں انہی کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ یہ سب ایک شریعت ہی کا معجزہ تھا، جو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی جس نے انھیں علم کی دولت دی، ادب سے روشناس کیا۔ دِلوں کو جلا دی۔ احساسات و خیالات میں شائستگی پیدا کی۔ عزت و کرامت کا شعور بخشا۔ کامل مساوات اور عدل کی فضا بنائی۔ نیکی اور بھلائی میں تعاون کو لازم قرار دیا اور بُرائی اور گناہ سے دُور رکھا۔ جہالت اور نفس پرستی کے اندھیروں سے نکال کر حریتِ فکر و ضمیر عطا کی۔ اور انھیں یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات اور مقصدِ وجود ہے۔ ایمان باللہ کے زیور سے آراستہ ہو کر انھیں یہی کام انجام دینا ہے اور ساری دُنیا کے سامنے یہی پیغام رکھنا ہے۔

جب تک مسلمانوں کا شریعت سے رابطہ قائم رہا ان کا یہی حال تھا۔ پھر جب انھوں نے اسے چھوڑ دیا تو ان کا وہ مقام بھی جاتا رہا۔ یا تو ترقیوں اور کامیابیوں کی راہ پر گامزن تھے یا پھر ان اندھیروں میں پلٹ آئے جن میں عرصے تک ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے اور ہر ظالم و جابر کے ظلم وستم کا شکار تھے۔

اس پستی کے عالم میں اہلِ یورپ کی طرف ان کی نگاہیں گئیں اور اُن کی ترقیوں نے ان کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اُنھوں نے سوچا کہ اہلِ یورپ کی ترقی کا راز ان کے ترقی یافتہ قوانین اور اصول میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ان کی نقل شروع کر دی اور اپنے آپ کو ان کے طرز پر ڈھالنا چاہا۔ لیکن یہ کوئی ان کے مرض کا علاج نہیں تھا بلکہ اُلٹا مرض بڑھانے والی روش تھی۔ چنانچہ اس غلط نقالی نے ضلالت وگمراہی، ذلت و ناداری اور ضعف وکمزوری کے ساتھ ساتھ انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور مختلف فرقوں اور گروہوں میں بانٹ دیا۔ ہر گروہ اپنے آپ میں مست تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ پھر ان کے درمیان ایسی جوتی پیزار شروع ہو گئی کہ تحسبهم جمیعا وقلوبهم شتّٰی کا منظر سامنے آ گیا

اگر مسلمانوں کے اچھے دن ہوتے تو یہ کھلی ہوئی حقیقت ان کی

نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی کہ ان کی شریعت ہر لحاظ سے کامل اور ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔ اپنے دامن میں سوسائٹی کی ترقی کے تمام اصول و آئین رکھتی ہے۔ قوموں کے عروج کے دن ہوں یا زوال کے آثار ہر حال میں ایک شریعت ہی ان کے لیے صحیح دستورِ عمل ہے اور یہی ان کی ترقی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصود ایک صالح سوسائٹی کا ز دبراہ لانا اور اسے ترقی کی راہیں دکھانا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں خود عبرت و نصیحت پذیری کا بہت بڑا سامان ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کو زندگی بخشنے والی یہی شریعت ہے۔ اسی نے انھیں تمام قوموں کی امامت عطا کی تھی اور تمام قوموں پر غلبہ و تسلط بخشا تھا۔ اس سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی، ترقی اور کامیابی سب اسی پر منحصر ہے اور اس کو اپنا دستورِ عمل بنانے ہی میں ان کی بقا ہے۔ شریعت ہی مسلمانوں کی اصل بنیاد ہے۔ بلکہ وہ مسلمان ہیں ہی اس لیے کہ اسلامی شریعت کے ماننے والے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آج اگر قوانین موضوعہ نے سوسائٹی کی رہنمائی و توجیہہ کو قانون کی غرض بنا لیا ہے تو یہ ان کی کوئی جدت نہیں ہے بلکہ اس باب

میں وہ شریعت کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جس کا آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی سے یہ اصول رہا ہے کہ وہ سوسائٹی کی تعمیر کرتی ہے، اسے صحیح رُخ پر ڈالتی ہے پھر اس کے معاملات کی تنظیم کرتی ہے۔ اگر آج علماء قانون ایک نئے اصول کو پالینے کے بعد بلند بانگ دعاوی کرتے ہیں تو یہ ان کی خوش فہمی ہے یا حقیقت سے ناواقفیت۔

شریعت کو قانون سے ممتاز کرنے والی چند جوہری خصوصیات

ان بنیادی اختلافات کی توضیح کے بعد اب ہم آسانی کے ساتھ شریعت کی وہ جوہری خصوصیات معلوم کرسکتے ہیں جو اسے قوانین موضوعہ سے ممتاز کرتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ تمام امور جن میں شریعت قوانین سے مختلف ہے یہی اختلافات اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اس لحاظ سے بیان کردہ اختلافات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریعت قوانین کے مقابلے میں تین امتیازی خصوصیات رکھتی ہے۔

پہلی خصوصیت اس کا کمال ہے یعنی ایک کامل و مکمل شریعت کو جن قواعد و اصول اور نظریات کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ سارے کے سارے اس میں موجود ہیں اور اس اعتبار سے وہ دوسروں کی خوشہ چینی سے قطعاً بے نیاز ہے۔ حال سے گذر کر مستقبل بعید میں

بھی وہ سوسائٹی کی تمام ضروریات کی پوری طرح کفیل ہو سکتی ہے۔

دوسری خصوصیت اس کی رفعت و بلندی ہے۔ یعنی اس کے قواعد و اصول سوسائٹی کی سطح سے بلند درجہ پر فائز ہیں اور ان کی یہ بلندی ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ یہ کچھ ایسے اصول و نظریات کی حامل ہے کہ خواہ سوسائٹی کتنے ہی ترقی کے منازل کیوں نہ طے کرے اور اس کی سطح کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو جائے، قوانینِ شرعیہ کی رفعت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔

تیسری خصوصیت اس کا دوام ہے یعنی خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے اور کیسے ہی حالات بدل جائیں، شریعت کی نصوص میں نہ اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے، نہ تبدیلی و تغیر کی۔ اس کی نصوص ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والی ہیں اور اس شان سے باقی رہنے والی ہیں کہ ہر زمانہ اور حالات کی ضروریات کو پورا کریں۔

شریعت کی یہ تینوں خصوصیات باوجود اپنی الگ الگ حیثیت کے اگر غور کیا جائے تو ایک ہی اصل سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ وہ یہ کہ اسلامی شریعت اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ہے اور اسی خالقِ جل و علا کی بنائی ہوئی ہے۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہ ہوتی تو اس میں کمال، رفعت و بلندی

اور دوام کی یہ شان نہیں ہو سکتی تھی؛ اس لیے کہ یہ خصوصیات ایک قادرِ مطلق خالق کی صنعت میں تو ہو سکتی ہیں، لیکن کمزور و عاجز مخلوق کی کسی صنعت میں ان کا ہونا ناممکنات سے ہے۔

قوانینِ موضوعہ کا ابطال

فرانسیسی انقلاب اور قوانینِ یورپ

اس میں شک نہیں کہ فرانسیسی انقلاب سے پہلے یورپ میں وضعی قوانین کو ایک حد تک غلبہ اور بالادستی حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان قوانین میں اخلاقی اصول اور دینی عقائد کی خاصی آمیزش تھی۔ اہلِ روما کے عہدِ قدیم سے اوامر و نواہی، عادات و اخلاق، احکامِ دینیہ اور عدالتی نظائر کی ایک معتد بہ مقدار متوارث چلی آرہی تھی اور تسلسل کے ساتھ ان پر عمل درآمد ہوتا چلا آیا تھا۔ انقلابِ فرانس کے بعد یورپ کے قانون سازوں نے قانون کی ان دیرینہ بنیادوں کو منہدم کرنا شروع کر دیا اور زیادہ تر مادی افادیت، ظاہری امن و امان اور نظم و نسق کو قانون کی بنا قرار دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون کا باطنی اور روحانی پہلو بہت بودا

اور کمزور ہو گیا اور افراد و اقوام کے قلوب قانون کی دسترس اور اس کے تسلط سے باہر ہو گئے۔ دین، عقائد اور اخلاق سے بے اعتنائی کے لازمی ثمرات یہ نکلے کہ انتشار، بدنظمی، سرکشی اور توہینِ قانون کی روش عام ہو گئی۔ آئے دن بغاوتیں اور انقلابات رونما ہونے لگے اور انسان کی زندگی سے امن، سکون اور اطمینان آہستہ آہستہ رخصت ہو گیا۔

قانون کے استخفاف کی اصل وجہ

قوانینِ جدیدہ کی اہانت اور بے حرمتی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انقلابِ فرانس کے وقت جن خوش آیند نظریات کا صور بڑے زور سے پھونکا گیا تھا اُن میں سے ایک نظریہ انسانی مساوات کا اور دوسرا عقیدے کی حریت کا تھا۔ ان دونوں نظریات کو آپس میں جمع کرنے اور تطبیق دینے کی جو شکل اس وقت قانون سازوں کی سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ قانون اور عقیدے میں کسی طرح کا علاقہ باقی نہ رہنے دیا جائے۔ یہ لوگ دراصل اس خام خیال میں مبتلا تھے کہ اگر عقیدہ و قانون کے باہمی ربط و تعلق کو برقرار رہنے دیا گیا تو یہ صورتِ حال آزادیِ فکر و عقیدہ کے منافی ہوگی اور اس کی وجہ سے مختلف العقیدہ گروہوں کے مابین قانونی مساوات بھی قائم نہیں ہو سکے گی۔ اس غلط فہمی کا یہ افسوسناک نتیجہ رونما ہوا کہ قانون کو کلیۃً غیر اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا

کاش کہ اس پیچیدگی کو اس طرح سے حل کیا جاتا جس طرح سے کہ اسلام نے اسے حل کر کے دکھایا ہے۔ اس حل سے اصل شہری بھی فوت نہ ہونے پاتا اور مضر نتائج بھی برآمد نہ ہوتے۔

مسئلہ مذکورہ کا اسلامی حل

یہ امر تو معلوم ہی ہے کہ قوانین اسلام کی بنیاد شریعت پر رکھی گئی ہے اور یہ قوانین اپنی فطرت اور اصل کے اعتبار سے لازمی مذہبی بلکہ دینی قوانین ہیں۔ اسلام میں یہ اصول بھی مسلم ہے کہ اس کے قوانین کا نفاذ مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے اور ان غیر مسلم ذمیوں پر بھی ہوتا ہے جو دار الاسلام میں متوطن ہو کر اس کی شہریت قبول کر لیں۔ دوسری طرف مساوات اور حریت فکر بھی اسلام کے مانے ہوئے معروف اصولوں میں شامل ہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو اسلامی مملکت ذمی شہریوں کے وجود پر مشتمل ہوگی اُسے اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا جس مشکل کا سامنا یورپ کے واضعین قانون کو کرنا پڑا تھا اور اسلامی قانون کے راستے میں بھی وہی ناقابل تسخیر چٹان حائل ہو جائے گی جس سے ٹکرا کر یورپ کے دینی و اخلاقی قوانین پاش پاش ہو گئے۔ اسلام نے اس اُلجھن کا ایک نہایت سیدھا سادا اور نہایت عمدہ حل تجویز کیا ہے۔ اُس نے خیالی دُنیا میں خوشنما نظریات کے بجائے واقعات کو ان کی اصلی شکل

میں دیکھا ہے اور ان کا عملی حل انسان کے سامنے رکھا ہے۔ اُس نے قانون کے اطلاق میں یہ اصول رکھا ہے کہ جن معاملات و حیثیات میں مسلم و غیر مسلم برابر ہیں، ان میں دونوں پر ایک ہی قانون نافذ کیا ہے اور جن اعتبارات میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں وہاں ان کے لیے قانون بھی مختلف تجویز کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن عام انسانی اور اجتماعی حیثیتوں سے ایک مسلمان اور ایک ذمّی برابر ہیں، ان تمام حیثیتوں میں انھیں ایک ہی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ البتہ ان دونوں کے عقائد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اس لیے جو قوانین عقائد سے متعلق ہوں گے، ان میں مساوات کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ جب عقائد ہی میں یکسانیت اور مساوات نہیں تو اس دائرے میں قانونی مساوات کے آخر کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک طرف اگر مساوی فریقین کے درمیان مساوات قائم کرنا صریح عدل کا تقاضا ہے وہیں دوسری طرف غیر مساوی اور متخالف فریقین کو مساوات کے نام پر ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا خالص ظلم ہے۔ چنانچہ شریعت نے جو قاعدہ اس بارے میں مقرر کیا ہے وہ مساوات کے بنیادی اصول کے ہرگز خلاف نہیں ہے بلکہ وہ عین مساوات ہے کیونکہ مساوات کی اصل روح اور اس کا اصل منشا عدل و انصاف ہی کا قیام ہے۔ عقائدِ دینیہ کے معاملے میں

اگر مسلم وغیر مسلم سے یکساں قانونی سلوک روا رکھا جائے تو اس سے بڑھ کر زیادتی اور بے انصافی کیا ہوگی۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ان دونوں کو اپنے عقائد کے خلاف قوانین کی پیروی پر مجبور کیا جائے اور انھیں اپنے عقائد پر عمل کرنے کی آزادی سے محروم کر دیا جائے۔ اس طرح کے قوانین بنانا نصِ قرآنی لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہوگی۔

اس ضمن میں مسلم وغیر مسلم کے مابین جس طرح قانونی تفریق کی گئی ہے اس کی ایک مثال شربِ خمر اور اکلِ خنزیر ہے۔ اسلام میں ان دونوں افعال کا ارتکاب مسلمان کے لیے حرام ہے اور شریعت کی نگاہ میں ایسا کرنا قانونی جرم ہے۔ لیکن ایک غیر مسلم جس کے مذہب میں یہ افعال حرام نہیں ہیں اسے شریعت نے اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس پر اس قانون کو نافذ کیا جائے تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کو شراب پینے اور سور کھانے کی قانونی اجازت دے دی جائے تو یہ ان کے دینی عقائد کی صریح توہین ہے۔ اس مثال سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن معاملات کا رابطہ عقائد سے ہے ان کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً اندھا دھند ایک ہی طرح کا قانون بنا دینا بالکل غلط اور دین و فطرت کے قطعی

خلاف ہے۔ اسی طرح اگر دین سے قانون کے رشتے کو بالکل کاٹ دیا جائے تو یہ فعل بھی پورے قانونی نظام پر ایک کاری وار کے مترادف ہے کیونکہ اس کے بعد قانون اپنا اخلاقی جواز اور روحانی اثر و اقتدار بالکل کھو دیتا ہے۔

انسانی قوانین کی بدترین قسم

گزشتہ بحث میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ قوانینِ شرعیہ کے مقابلے میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین ہر لحاظ سے ناقص ہیں لیکن ان بشری قوانین میں سے بھی بدترین اور ناقص ترین قوانین وہ ہیں جنھیں بناتے وقت اس قوم کے مفادات، خصوصیات اور روایات کو بھی مدِنظر نہیں رکھا جاتا جس قوم کے نام پر وہ قوانین وضع کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے قوانین کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ قومی افکار و نظریات، قومی اخلاق اور قومی خصائص و معروفات کی بھی عین ضد ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے قوانین کی پشت پر پوری طاقت موجود ہوتی ہے جو ان کا لوہا جمہور سے منوانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے لیکن ان قوانین کو کبھی تمکن، غلبہ اور قرار نصیب نہیں ہو سکتا اور ہو بھی کیسے جبکہ وہ افراد کے معتقدات سے متصادم ہوتے ہیں، ان کے اخلاق کو بگاڑتے ہیں اور ان کے قلب و ضمیر کو اذیت اور عذاب میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس

طرح کے قوانین کے لیے اطاعت کا مطالبہ کرنا اور اس کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے بلکہ اس قسم کے قانون کے بارے میں جس چیز کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ عوام الناس کے اندر اس کے خلاف غم و غصہ اور عداوت کے جذبات اُبھریں گے اور وہ اس طرح کے قانون اور اُس کے حامیوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ ایسے قوانین کی مخالفت کو جبر و تشدد کے ذریعے سے کبھی بھی نہیں دبایا جا سکتا، مادی طاقت کے ذریعے اُس مزاحمت کو تو ختم کیا جا سکتا ہے جو صرف مادی وسائل کے ساتھ اور مادی اغراض کے تحت پیدا ہوئی ہو لیکن جو مزاحمت عقائد و افکار کے بل پر اور عقائد و افکار ہی کی خاطر رونما ہوئی ہو وہاں تو حال یہ ہو جاتا ہے کہ

بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

بلادِ اسلامیہ کے قوانین

قانون کی جس بدترین نوع کا ذکر اوپر گزرا ہے، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں کم و بیش اسی قسم کے قوانین رائج ہیں۔ ہم اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں کہ ان سے قانون کا اصل منشا اور مقصد ہی فوت ہو رہا ہے، ان کو ہمارے اصول و مصالح سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے اور ان کو ہماری جانب منسوب کرنا کسی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے۔ نہ

ہمارے دل و دماغ میں ان کے احترام کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہم ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ ممالکِ اسلامیہ نے جس دن سے اسلام کو قبول کیا ہے اُسی دن سے وہاں اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آگیا تھا۔ یہ قوانین صدیوں تک جاری اور نافذ رہے حتّٰی کہ یورپ کے استعمار پسندوں نے ان ممالک کو اپنے تسلط میں لے لیا اور وہاں یا تو خود مغربی قوانین کو رائج کر دیا یا مقامی حکمرانوں کو ترغیب دے کر اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے مربیوں کے زیرِ سایہ جدید طرز کے قوانین اپنے ہاں وضع کریں۔ اس کارروائی کے لیے بار بار جو دلیل پیش کی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ان قوانین سے مقصود یہ ہے کہ مغرب کی ترقی یافتہ تہذیب سے معاشرہ کو آشنا کیا جائے۔ گویا کہ مغرب کی تمدن کے معراجِ کمال تک رسائی ہو چکی ہے اور مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی تنہا وجہ قوانینِ شریعت کی پابندی ہے! یہ دلیل اپنے بودے پن کے باوجود بعض دماغوں میں جاگزیں ہوگئی حتّٰی کہ اسے عام طور پر صحیح سمجھا جانے لگا، اسے کتابوں میں لکھا جانے لگا اور مدارس میں اسے پڑھایا جانے لگا۔

دلیلِ باطل

اس دلیل کے علمبردار اگر کچھ بھی غور و فکر سے کام لیتے تو انھیں معلوم ہوجاتا کہ ان کی دلیل بالکل لغو اور باطل ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچتے تو انھیں اندازہ ہوجاتا کہ جن

قوانین پر وہ لٹو ہوئے جا رہے ہیں وہ تمام تر پرانے لاطینی قوانین سے ماخوذ ہیں۔ جب مسلمانوں کا تصادم رومی سلطنت سے ہوا تھا اُس وقت یہ قوانین رومیوں کے کچھ بھی کام نہ آسکے تھے اور مسلمانوں نے اس عظیم الشان مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اسی طرح صلیبی لڑائیوں میں پورے یورپ کو مسلمانوں کے مقابلے میں شکستِ فاش ہوئی تھی حالانکہ اس سارے برِ اعظم میں اُس وقت رومن لا ہی کی عملداری تھی پھر تاریخ کے مطالعے سے اس حقیقت کا معلوم کرلینا بھی کچھ مشکل نہیں ہے کہ عرب میں امتِ مسلمہ کا آغاز ایک قلیل اور ضعیف جماعت کی حیثیت سے ہوا تھا اور ہر دم یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ ان کے وجود کو ہی ملیا میٹ نہ کر دیا جائے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بیس سال بعد جو ریاست الٰہی قوانین شرعیہ پر قائم ہوئی تھی اس نے فارس کی سلطنت کو تو بالکل صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا اور رومی بادشاہت کے تسلط سے شام، مصر اور شمالی افریقہ کو آزاد کرالیا۔ اس کے بعد ایک ہزار سے زائد برس تک مسلمانوں کو اقوامِ عالم کی امامت اور قیادت کا منصب حاصل رہا۔ انھوں نے صلیبیوں کا قلع قمع کیا، تاتاریوں کو مغلوب کیا اور مشرقی، جنوبی اور مغربی یورپ میں جاکر اسلام کا جھنڈا گاڑا اور وہاں بھی صدیوں تک ریاست اور حکومت کا کاروبار اسلامی قوانین

کے تحت سرانجام پاتا رہا۔

کاش کہ یہ غافل اور سادہ لوح لوگ مصر کے ماضی قریب پر ہی نگاہ ڈال لیتے۔ محمد علی پاشا کے عہد میں مصر یورپ کے بہت سے ممالک سے زیادہ طاقتور تھا۔ مصر نے اُس وقت فرانسیسیوں کو مار مار کر بھگا دیا تھا اور انگلستان کا مقابلہ سمندر میں جا کر کیا تھا۔ مصری افواج نے یونانیوں کے گھر میں جا کر ان کے دانت کھٹے کر دیئے تھے حالانکہ اس وقت یورپ کی متعدد حکومتیں یونان کی مدد کر رہی تھیں۔ اُس وقت اگر دولِ یورپ سازش کر کے ہمارے خلاف متحد نہ ہو جاتیں تو حجاز، سوڈان، شام، ترکی اور مصر آج ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے۔ اس سارے دور میں ہمارے ہاں یورپ کے قوانین نہیں بلکہ شرعی قوانین رائج تھے۔

ان سارے واقعات کے باوجود اگر کوئی کہنے والا یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث شرعی قوانین ہیں اور یورپ والوں کی ترقی کا سبب مغربی قوانین ہیں تو اس پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات غفلت یا غرض پرستی آدمی کو بالکل اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ اس طرح کے نادان لوگوں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں اور مغربی قوموں کی تاریخ کا کچھ مطالعہ کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کامیابی اور سرخروئی

کی اصلی علت کیا ہے:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ	کیا یہ لوگ زمین میں نہیں پھرے تاکہ
فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ	ان کے دل ہوتے جن سے یہ سمجھتے یا
بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا	کان ہوتے جن سے سنتے یقیناً
فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ	آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل
تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ	اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں
(الحج: ٤٦)	ہیں۔

مسلمانوں کو زوال اتباعِ شریعت سے نہیں ترکِ شریعت سے ہوا

مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا باعث شریعت ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانینِ شریعت روئے زمین کے تمام قوانین سے افضل اور اشرف ہیں۔ قانون کا کوئی بہتر سے بہتر نظریہ آج تک منکشف نہیں ہوا جو شریعت میں اپنی مکمل اور عمدہ ترین شکل میں موجود نہ ہو۔ علماء قانون نے قانون کا کوئی جدید سے جدید تر تصور اور تخیل ایسا نہیں پیش کیا جو شریعت میں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود نہ ہو۔ مسلمان آج اس لیے ذلیل و خوار نہیں ہیں کہ وہ شریعت کے قوانین پر عامل ہیں بلکہ ان کی ذلت کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔

آج تمام دیارِ اسلامیہ کے مسلمان محض زبانی دعوے کرنے والے نام کے مسلمان ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور اعمال کے لحاظ سے مسلمان نہیں ہیں الّا ماشاء اللہ وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ۔

اگر قوانین میں جدت ہی قوموں کی ترقی کا باعث ہوتی تو بلجیم انگلستان سے زیادہ طاقتور اور ترقی یافتہ ہوتا کیونکہ بلجیم کے قوانین جدید ترین ہیں اور انگلستان کے متعدد قوانین قدیم ترین ہیں اور ان میں بہت سے قوانین اس وقت سے چلے آرہے ہیں جبکہ انگلستان بالکل مجہول الحال تھا اور دنیا میں اسے کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہ تھا۔ پھر جو لوگ شریعتِ اسلامیہ کے قوانین کو قدیم اور بوسیدہ سمجھتے ہیں ان کا یہ خیال ہی غلط فہمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ یورپ کے بیشتر ضابطہ ہائے قوانین کے بالمقابل شریعت کے قوانین قدیم نہیں بلکہ جدید ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے قوانین کی بنا رومن لا پر رکھی گئی ہے۔ ان کی اٹھان رومن قانون کے نصوص و قواعد کے حدود اربعہ میں ہی ہوئی ہے۔ ان کے اندر سارے اساسی اور بنیادی تصورات و نظریات وہی کام کر رہے ہیں جو رومی متقنین نے پیش کیے تھے۔ یورپ کے قوانین کی تخریج اور استنباط کا سارا کام انہی اصول و حدود کے دائرے میں سرانجام دیا جاتا ہے، الّا یہ کہ کسی شدید ضرورت کی بنا پر اس راستے سے ہٹنا پڑے۔

اس لحاظ سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے ماخذ اور مبداء کے اعتبار سے قوانینِ اسلامیہ یورپین قوانین کی بہ نسبت جدید تر ہیں نہ کہ قدیم تر، کیونکہ اسلام کے قوانین کی اصل قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور قرآن وسنت کا نزول رومن لا کی تشکیل کے بعد ہوا ہے۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت اپنے ذہن سے کبھی محو نہیں کرنی چاہیے کہ شریعت ہی انھیں عدم سے وجود میں لانے، انھیں خیرالامت بنانے اور دنیا بھر میں انھیں سرفراز کرنے کا موجب ہوئی ہے۔ شریعت نے ہی ان کی تعلیم وتربیت کی۔ انھیں علوم وآداب سکھائے اور انھیں عزت وشرافت کے جوہر سے آشنا کیا۔ شریعت ہی نے ان کے اندر قوت اور عزیمت پیدا کی، ان کے اندر ایسے ایسے جہانبان اور کشورکشا پیدا کیے جنھوں نے چار دانگِ عالم میں عظیم الشان مملکتوں کی بنیاد رکھی۔ ایسے ایسے علما وادبا پیدا کیے جنھوں نے علم وادب کی بے نظیر خدمات سرانجام دیں۔ مسلمانوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کا قانون سب سے پہلا قانون ہے جس نے انسانوں کے مابین مساواتِ تامہ اور عدالتِ مطلقہ کے تصور کو عملی جامہ پہنایا اور ان پر تعاون علی البر والتقویٰ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب ٹھہرایا۔ ان مقاصد

کے حصول کے لحاظ سے قوانینِ موضوعہ شرعی قوانین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں نے جب تک شریعت کا دامن تھامے رکھا دنیا میں وہ کامران اور سرخرو رہے اور جب انھوں نے اس کا دامن چھوڑ دیا اُس وقت وہ اسلام سے قبل کی جاہلیت اور تاریکی کی طرف لوٹ گئے۔ ضعف، ذلت اور مسکنت نے انھیں آ دبوچا اور وہ اس قابل بھی نہ رہے کہ ظالم کی دراز دستیوں کے مقابلے میں اپنی مدافعت کر سکیں۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمان ایمان لائے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے ایمان لانے کا حق ادا کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں زمین میں تمکن عطا کیا۔ جس قدیر و عزیز نے اُن مسلمانوں کو قلت اور ضعف کے باوجود طاقت بخشی تھی وہ یقیناً اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ ہمیں بھی طاقت اور قوت بخشے بشرطیکہ ہم بھی ایمان کا حق ادا کریں۔ یہ اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا وعدہ وفا کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ

وعدہ کیا ہے اللہ نے اُن لوگوں سے
جو ایمان لائے ہیں تم میں سے اور
اعمال کیے ہیں انھوں نے اچھے کہ

مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ (النور : ۵۵)

خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں جیسے کہ خلیفہ بنایا اُن لوگوں کو جو اُن سے پہلے تھے ۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (المائدہ : ۱۵)

آ گئی ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب مبین ۔ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اپنی رضا کی پیروی کرنے والوں کو اور نکالتا ہے انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف اپنے اذن سے اور انہیں سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے ۔

قوانین وضعیہ کا ابطال

ہر ایسا قانون جو قرآن و سنت اُس کے اصول و مبادی اور اُس کی رُوح کے خلاف ہو وہ مطلقاً باطل اور کالعدم ہے ۔ کسی مسلمان کے لیے اُس کی اطاعت جائز نہیں بلکہ اس کے خلاف محاربہ لازم ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کے اوامر و نواہی کا مقرر کیا جانا کوئی فعل عبث نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگ اُن کی اطاعت کریں ۔ جو رسول کی لائی ہوئی شریعت کے

مطابق عمل کرتا ہے اس کا فعل صحیح اور جائز ہے کیونکہ وہ شارع کے حکم کے موافق ہے اور جو شریعت کی مخالفت کرتا ہے اس کا فعل باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء: ٦٤)	ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔
وَمَآ آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا۔ (الحشر: ۷)	جو کچھ تمہیں دے رسول اسے لے لو اور جس سے تم کو منع کرے رک جاؤ۔

بطلان کے دلائل | اسلام میں قانون سازی کے مآخذ کتاب، سنت اور اجماع ہیں اور ان تینوں کے اندر اس بات کے حق میں دلائل موجود ہیں کہ شریعت سے آزاد ہو کر جو قانون سازی بھی کی جائے وہ باطل اور بے اصل ہے۔ قرآن اور سنت کے نصوص اس بارے میں بالکل قطعی اور صریح ہیں اور ان نصوص کی موجودگی میں اجماع کا انعقاد ایک ناگزیر امر تھا۔ ذیل میں ہم غیر شرعی قوانین کے ابطال کے حق میں چند دلائل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اطاعت اور اتباع کی صرف دو قسمیں قرآن میں

بیان فرمائی ہیں۔ یا تو اتباع اللہ اور اُس کے رسولؐ کے فرمان کا ہے
اور یا پھر اتباعِ ہوٰی اور خواہشاتِ نفس کی اطاعت اور پیروی ہے۔
ان دونوں کے مابین کوئی تیسری شکل نہیں ہے اور ان دونوں میں
سے ایک خالص ہدایت ہے اور دُوسری خالص ضلالت۔

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ	اگر وُہ تمہاری بات نہ مانیں تو جان لو
فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ	کہ وُہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی
أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ	کر رہے ہیں اور کون بڑھ کر گمراہ ہے
اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ	اُس سے جو اپنی خواہش کی پیروی کرے
اللّٰهِ۔ (القصص: ۵۰)	بغیر اللہ کی ہدایت کے۔
يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ	اے داؤد ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ
خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ	بنایا ہے پس حکومت کرو لوگوں کے
بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ	درمیان حق کے ساتھ اور مت پیروی
الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ	کرو خواہش کی ورنہ وُہ تجھے سیدھے
اللّٰهِ۔ (ص: ۲۶)	راستے سے بھٹکا دے گی۔
ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ	پھر ہم نے تم (محمدؐ) کو حکم دینے
مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا	کے ایک طریقے پر قائم کیا۔ پس اس
تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ	کا اتباع کرو اور مت پیروی کرو ان

لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (الجاثیہ: ۱۸) | کی خواہشات کی جو نہیں جانتے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۔ (الاعراف: ۳۰)

پیروی کرو اُس چیز کی جو اُتاری گئی ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اور مت پیروی کرو اُس کے علاوہ اولیا کی کم ہی تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

ان نصوصِ قرآنیہ نے اتباعِ خلافِ شریعت کو قطعی طور پر حرام قرار دے دیا ہے اور شریعت کے سوا کسی دوسری شے پر عمل کرنے کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا ہے۔ جو آدمی ایسا کرتا ہے اُس پر اتباعِ ہویٰ اور ضلالت کا حکم لگا دیا گیا ہے۔ ایسا شخص گمراہ ہے، ظالم ہے، اللہ کے اُتارے ہوئے احکام کا باغی ہے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنانے والا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے تحاکم الیٰ غیر اللہ کو حرام قرار دیا ہے اور مومن کے لیے اس بات کو جائز نہیں ٹھہرایا کہ وہ اللہ کے حکم کے ماسوا کسی دوسرے کے حکم پر راضی اور مطمئن ہو۔ اگر وہ ایسا کرے تو اسے دُور کی گمراہی اور شیطان کی پیروی قرار دیا گیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ | کیا تُو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی

أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا۔ (النساء: ٦٠)	طرف جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اُس چیز پر جو اُتاری گئی ہے تیری طرف اور جو اتاری گئی ہے تجھ سے پہلے۔ وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہ کر کے دور بھٹکا دے۔

پس جو کوئی اللہ کی نازل کی ہوئی اور اُس کے رسولؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے نہیں کراتا، اُس نے یقیناً طاغوت کو اپنے لیے حَکَم بنا لیا ہے۔ اللہ کی مخلوقات میں سے جو کوئی بندگی کے مقام سے بڑھ کر معبود، متبوع اور مطاع کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے وُہ طاغوت ہے۔ چنانچہ اللہ اور اُس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا جس کسی کو بھی اپنے تنازعات میں ثالث بنایا جاتا ہے اُس کی عبادت کی جاتی ہے یا اس کی غیر مشروط اطاعت کی جاتی ہے، وُہ طاغوت کی تعریف میں آجاتا ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وُہ غیر اللہ پر بھی ایمان لائے اور جس نے

اللہ سے فیصلہ طلب کرنے کا عہد کر لیا ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ غیر اللہ سے بھی جا کر فیصلہ طلب کرے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لیے یہ جائز نہیں رکھا ہے کہ وہ کسی ایسے معاملے میں اپنے لیے آزادیِ انتخاب کو استعمال کرے جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے کوئی فیصلہ صادر فرما دیا ہو۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ قرآن کی رو سے وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ (الاحزاب: ۳۶)	کسی مومن یا مومنہ کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے کوئی اختیار باقی رہ جائے (یا انتخاب کا موقع رہ جائے)۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق ہر معاملے میں فیصلہ کریں:۔

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ۔ (المائدہ: ۴۹)	اور یہ کہ فیصلہ کرو ان کے درمیان اس چیز کے مطابق جو اللہ نے نازل کی ہے
إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ	ہم نے نازل کی ہے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ تاکہ تو فیصلہ کرے لوگوں

بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ۔ (النسا: ۱۰۵)	کے درمیان اُس چیز کے مطابق جو اللہ نے تم کو سجھائی ہے۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ .... هُمُ الظَّالِمُوْنَ .... هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ (المائدہ: ۴۴-۴۷)	جو کوئی اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں ...... ظالم ہیں ...... فاسق ہیں۔

مسلمانوں میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کے نازل کردہ احکام کے علاوہ کسی دوسرے طریق پر اپنے معاملات کے فیصلے کراتا ہے اُس پر اللہ تعالیٰ کی اِن تینوں آیات میں سے ایک نہ ایک آیت ضرور صادق آتی ہے۔ مثلاً چوری یا قذف یا زنا کے معاملے میں اگر کوئی شخص اپنے مقدمے کا فیصلہ غیر اسلامی قوانین کے مطابق اِس لیے کرانا چاہتا ہے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو اسلامی قوانین سے افضل اور بہتر سمجھتا ہے تو وہ قطعی کافر ہے۔ اپنے دِل اور اپنی زبان سے اگر ایک شخص اسلامی قوانینِ تعزیرات کی برتری کو تسلیم کرتا ہے لیکن ضعفِ ایمانی یا کسی دوسری مجبوری کی بنا پر وہ غیر اسلامی قوانین سے مدد لیتا ہے تب بھی فاسقین کے زمرے میں شامل ہونے سے وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اور اگر وہ کسی کی

حق تلفی یا کسی سے بے انصافی بھی کرتا ہے تو وہ ظلم کا ارتکاب بھی کرتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں رسول ؐ کو اپنا ثالث اور پنچ نہ تسلیم کرے۔ پھر ایمان کے لیے اس طرح کی تحکیم کا محض ظاہری اور مجرد صورت میں مان لینا کافی نہیں ہے بلکہ ایمان کے وجود اور اثبات کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سپر ڈال دینے کا فعل پوری خوشدلی اور آمادگیٔ نفس کے ساتھ سرانجام پائے اور ظاہر ہے کہ رسول ؐ کا فیصلہ یا تو کتابِ الٰہی کے نصوص پر مبنی ہوگا اور یا اللہ کی عطا کردہ اس حکمت و بصیرت پر مبنی ہوگا جس کا عملی مظاہرہ "سنت" کی شکل میں وجود پذیر ہوا ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ	نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ ایمان
حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ	نہیں لا سکتے جب تک کہ وہ تجھے حَکَم
بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي	نہ بنا لیں اپنے تنازعہ فیہ معاملات میں
أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا	پھر نہ پائیں اپنے دل میں تنگی آپ کے
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا	فیصلے کی وجہ سے اور سرِ تسلیم خم

تَسْلِيْمًا ﴿النّساء: ۶۵﴾ کر دیں۔

۶۔ جو شے اسلام میں حرام ہے وہ دنیوی قوانین و احکام کے حلال کر دینے کے باوجود حرام ہی رہتی ہے۔ اسلام میں حقِ قانون سازی مقید اور مشروط ہے اور اس حق کو ایک مسلمان بھی اسلام کی عائد کردہ حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ہیئت حاکمہ ان حدود سے تجاوز کرے اور اس طرح کے قوانین کو بنانا اور نافذ کرنا شروع کر دے جن کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے تو ایک مسلمان کے لیے ان قوانین کا اتباع و نفاذ از روئے شرع واجب نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ان کے بدلنے کے لیے کشمکش اور جدّ و جہد کرے

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ﴿النّساء: ۵۹﴾	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی۔ اگر تم میں تنازع ہو جائے کسی شے میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ یہ بہتر اور عمدہ ہے انجام کے اعتبار سے۔

اللہ جلّ شانہ نے اپنی اطاعت اور اپنے رسولؐ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اطاعت کے فعل کی تکرار سے پتہ چلتا ہے کہ اطاعتِ رسولؐ کی بھی ایک مستقل حیثیت ہے۔ رسولؐ جس بات کا بھی حکم دے، خواہ وہ قرآن میں مذکور ہو یا نہ ہو، اس کی اطاعت واجب ہے۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اسی جیسی ایک چیز عطا کی گئی ہے (اوتیت الکتٰب ومثلہ معہ)۔ اولی الامر کے ساتھ اطاعت کے لفظ کو دہرایا نہیں گیا۔ کیونکہ یہ اطاعت مستقل بالذّات نہیں ہے بلکہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے تحت آتی ہے۔ اسی طرح سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پہلے آیا ہے اور اولی الامر کا ذکر بعد میں۔ گویا کہ سبقت اور تقدّم اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کو حاصل ہے۔ جب اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا حق ادا ہو چکتا ہے اور جب ان کی مخالفت کا امکان باقی نہیں رہتا اس وقت اولی الامر کی اطاعت لازم آتی ہے۔ پس جو حکمران اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق حکم دیتا ہے اس کی اطاعت واجب ہے اور جو اس کے خلاف حکم دے اس کے لیے سمع وطاعت کا حق ہرگز ثابت نہیں ہے۔

غیر شرعی قوانین کے ابطال پر دلائل

۷) قرآن کے بعد سنت نے بھی نہایت

وضاحت سے اولو الامر کی اطاعت کے حدود کو واضح کر دیا ہے اور اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف امراء کی اطاعت سے منع فرما دیا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل احادیث صحیحہ سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے:

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق انما الطاعة فی المعروف۔	خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت جائز نہیں۔ اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔
من امرکم منهم بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔	ان (امراء) میں سے جو کوئی تمہیں معصیت کا حکم دے تو مت سنو اور مت مانو۔
السمع والطاعة علی المرء فیما احب وکره الا ان یؤمر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔	مرد پر سمع و طاعت واجب ہے خواہ وہ پسند کرے یا نہ کرے اِلّا یہ کہ اُسے خدا کی نافرمانی کرنے کا حکم دیا جائے تب سمع و طاعت لازم نہیں۔
انه سیلی امرکم من بعدی رجال یطفئون السنة ویحدثون البدعة	میرے بعد ایسے لوگ حکمران ہوں گے جو سنت کو مٹائیں گے، بدعات کو رائج کریں گے اور نماز کو اپنے وقت سے

ویؤخرون الصلوٰۃ عن	موخر کردیں گے۔ ابن مسعودؓ نے عرض
مواقیتھا قال ابن مسعودؓ	کیا یا رسول اللہ، اگر میں ایسے لوگوں
یا رسول اللہ کیف بی	کو پاؤں تو کیا کروں۔ آپؐ نے
اذا ادرکتھم قال لیس	فرمایا اے ابن ام عبدؓ جو اللہ کی
یا ام عبد طاعۃ لمن	نافرمانی کرے اُس کی اطاعت جائز
عصی اللہ۔ قالھا ثلاث	نہیں۔ آنحضورؐ نے ایسا تین مرتبہ
مرات۔	فرمایا۔

(۸) نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اُمّتِ اسلامیّہ کا اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ حکّام کی اطاعت صرف احکامِ الٰہی کے تحت جائز ہے۔ فقہا و مجتہدین کا اس بارے میں کامل اتّفاق ہے کہ اصل حاکم اور صاحبِ امر صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس بارے میں قطعی طور پر کوئی قولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔ اس بارے میں بھی کُلّی اجماع ہے کہ جن امور کی حرمت متّفق علیہ ہے انھیں حلال اور جائز سمجھنا کفر و ارتداد ہے۔ چنانچہ جو شخص مثلاً زنا یا شراب کو حلال سمجھتا ہے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی اور کو امر و نہی کا مطلق مجاز اور مختار سمجھتا ہے اُس کا ایسا سمجھنا صریح کفر ہے۔ اسی طرح جو حاکم صریح کفر و ارتداد کا مرتکب ہوتا ہے اُس کے خلاف خروج واجب

ہے اور اس خروج کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُس حاکم کے اُن اوامر ونواہی کی مخالفت کی جائے جو اسلام سے ٹکراتے ہوں۔

(۹) اسلام کے اصول ومبادی کے لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو اسلامی ریاست کے کارفرماؤں کو قانون سازی کے غیر محدود اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ اُن کے لیے قانون سازی کا حق صرف دو حیثیتوں سے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ وہ تنفیذی قوانین وضع کریں یعنی شریعت کے احکام ونصوص کے نفاذ کے لیے قواعد وضوابط اور ان کی عملی صورتیں متعین کریں۔ دُوسرے یہ کہ وہ تنظیمی نوعیت کے قوانین بنائیں، یعنی اس طرح کے قوانین کی تشکیل کریں جو اسلامی معاشرے کے نظم کو برقرار رکھنے اور اس کی اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہوں۔ یہ دوسری قسم کی قانون سازی اُسی دائرے میں عمل پذیر ہوتی ہے جس میں نصوصِ شرعیہ خاموش ہوں۔ قسم دوم کے قوانین کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ ان کی تشکیل پر کوئی حد بندی نہ ہوگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نوعیت کی قانون سازی میں بھی ہمیں مطلق اور کلی اختیارات نہیں دیے گئے ہیں بلکہ اس طرح کے قوانین بناتے وقت بھی شریعت کی رُوح اور اُس کے اصولِ عامّہ کو ہمیشہ نگاہ کے سامنے رکھنا پڑتا ہے اور انہی کی روشنی میں تنظیمی قوانین کا اجرا اور عمل میں لانا پڑتا ہے۔ اس

لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دونوں قسم کی قانون سازی حدود اللہ کے اندر مقید ہے۔ ہمارے حکمراں، اور مقننین ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا ہیں اور دوسری طرف وہ جماعت اسلامیہ کے نائب اور نمایندہ ہیں۔ خلیفۂ رسول ؐ ہونے کی حیثیت سے اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کتاب وسنت سے سرِ مو انحراف کریں اور اسی طرح مسلمانوں کے نمایندہ ہونے کی حیثیت سے بھی اُن کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی مسلک اور نظریات کی خلاف ورزی کریں۔ انھیں رسول ؐ کی جانشینی اور مسلمانوں کی نیابت کا منصب اس لیے سونپا گیا ہے کہ وہ دین کے قیام کے لیے جدوجہد کریں، نہ یہ کہ دین کے انہدام کے درپے ہوں۔

(۱۰) مسلمانوں کے دستور کی اساس شریعت ہے اس لیے جو قانون اس کے مطابق ہوگا وہ جائز ہوگا اور جو اس کے خلاف ہوگا وہ باطل ہوگا۔ شریعت اس وقت تک واجب الاتباع ہے جب تک اُسے منسوخ نہ کر دیا جائے لیکن اللہ کی ایک کتاب کو اللہ کی دوسری کتاب ہی منسوخ کر سکتی ہے اور ایک رسول ؐ کی سنت ہی دوسرے رسول ؐ کی سنت کی ناسخ ہو سکتی ہے۔ کتب و رسل کا سلسلہ اب بند ہو چکا ہے اس لیے قوانینِ شرعیہ میں ترمیم و تنسیخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی انسانی قوانین شرعی قوانین کی جگہ لے سکتے ہیں۔

مصری قانون

مصری قوانین کا بطلان

عام انسانی قوانین کے عدم جواز کے وجوہ تو بیان ہو چکے ہیں مگر مصری قوانین کے باطل ہونے کے مزید وجوہ بھی موجود ہیں۔ ان کے بطلان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان قوانین کی اکثریت خود مصری دستور کی مخالف ہے۔ مصری دستور[1] میں یہ دفعہ ابتدا ہی میں ثبت کی گئی ہے کہ ریاست کا رسمی اور سرکاری دین اسلام ہے (دین الدولۃ الرسمی هو الاسلام) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے قانونی نظام کا دستوری سنگِ بنیاد اسلام ہے، اسلام ہی وہ مآخذ اور سرچشمہ ہے جس سے سارے قوانین کی تخریج کی جائے گی اور یہی ایک منبع و مرجع ہے جہاں سے قانون بناتے وقت رہنمائی حاصل کی جائے گی۔ حقیقت میں یہ دستوری دفعہ

[1] افسوس ہے کہ یہ دستور بھی اب "انقلاب" کی نذر ہو چکا۔ (مترجم)

ہماری سیاست، ہماری معاشرت اور ہماری داخلی اور خارجی پالیسی سے متعلق قوانین پر ایک قید لگا دیتی ہے۔ ہم شریعتِ اسلامیہ کے عائد کردہ حدود و قیود سے باہر اور اس کی رُوح کے خلاف کوئی قانون سازی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس لیے ایک مصری پر از رُوئے دستور بھی لازم ہے کہ وہ سارے غیر اسلامی قوانین کو باطل سمجھے کیونکہ وہ خلافِ دستور ہیں۔

وضعی قانون (Administrative Law) ہمیشہ دستوری قانون (Constitutional Law) کے تابع ہوتا ہے اور اگر دونوں میں تخالف ہو تو اول الذکر کو آخر الذکر کی روشنی میں کالعدم اور باطل قرار دینا ضروری ہوتا ہے۔ مصری عدالتیں ایسے قوانین کو باطل قرار دیتی رہی ہیں چنانچہ مصر کی عدالتِ عالیہ نے اپنے فیصلہ نمبر ۱ : ۱۹۵۰ء میں تحریر کیا ہے کہ دستور کے مبادی میں سے کسی اصل و مبدأ کو اگر کسی قانون میں نظر انداز کر دیا جائے تو وہ قانون خلافِ دستور (Ultravires of the constitution.) ہے۔ اس فیصلے کی رُو سے مجلس الدولہ کا وضع کردہ ایک قانون باطل قرار دیا گیا تھا۔ دستور کی بالادستی اور قانون کے استحکام کے لیے بہترین ضمانت یہ ہے کہ قانون سازی میں ہمیشہ دستوری حدود کو ملحوظ رکھا جائے۔ عدالتوں کو بھی یہ پورا حق حاصل ہے کہ وہ قانون کی صحیح تعبیر و تنقید کریں اور قوانین میں تعارض کی صورت میں فیصلہ

کریں کہ کونسا قانون دستور کے مطابق ہے اور کونسا مخالف! بلکہ عدالتوں پر یہ لازم ہے کہ اگر کوئی قانون دستور سے متصادم ہو تو وہ اسے باطل قرار دیں اور اس پر دستور کا غلبہ تسلیم کریں کیونکہ دستور قانونِ اعلیٰ ہے اور عام قانون پر اسے اتباع کے لحاظ سے فوقیت اور ترجیح حاصل ہے۔

قوانینِ عامہ کے بارے میں ایک مسلّم اصول یہ بھی ہے کہ جو قوانین اس نوعیت کے ہوں کہ وہ قانون کے معروف تصورات کے خلاف پڑتے ہوں ان کی ایسی تعبیر کرنی چاہیے جو قانون کے بنیادی مقصد اور منشا کے مخالف نہ ہو۔ چنانچہ اُمتِ مسلمہ کے بارے میں جب یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تو اجنبی قوانین کے معاملے میں یہ ضروری ہو گا کہ انھیں بلادِ اسلامیہ میں نافذ کرنے سے پہلے اُن کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں غیر اسلامی اجزا کو حذف کیا جائے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جو مغربی قوانین ہمارے ہاں رائج کیے گئے ہیں کس طرح وہ قانون کے بنیادی فریضے کی ادائگی میں ناکام رہے ہیں اور کس طرح وہ قانون کے معروف اصولوں سے متصادم ہیں۔ پس اس لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ امر لازم آتا ہے کہ ان مغربی قوانین کے غیر اسلامی پہلوؤں کو نفاذ کے وقت ترک کر دیا جائے

اور انھیں بلا ترمیم و تنسیخ جُوں کا تُوں اختیار نہ کیا جائے۔

مغربی قوانین کے اثرات

یہ قوانین دراصل ایسے ممالک کے لیے وضع کیے گئے جن کا ماحول ہمارے ماحول سے الگ ہے۔ وہاں کے باشندگان سے ہمارا اتفاق کم اور اختلاف زیادہ ہے۔ ان قوانین میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ ان کے بعض اجزا ہمارے عقائد کے موافق ہیں اور بعض مخالف ہیں۔ بعض ہمارے اخلاق و عادات کے مطابق ہیں اور بعض نہیں ہیں۔ ان کے کچھ حصوں کو ہمارا قلب و ضمیر قبول کرتا ہے اور کچھ حصوں سے نفرت اور ابا کرتا ہے۔ ان قوانین نے ہمارے افکار کو فاسد کر دیا ہے، ہمارے ذہنوں کو پراگندہ کر دیا ہے، ہمارے دلوں کو مسخ کر دیا ہے اور ہماری زندگی کو بگاڑ دیا ہے۔ انھوں نے ہماری صفوں میں انتشار برپا کر دیا ہے، ہمارے قلوب کو رنج والم سے بھر دیا ہے اور ہمارے سینے میں تلخی کا بیج بو دیا ہے ان قوانین نے ہمارے اندر عجیب و غریب منطق اور خطرناک قسم کا تضاد اور اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ ہم بیک وقت ایک چیز کو حلال بھی قرار دیتے ہیں اور اسے حرام بھی سمجھتے ہیں، ہم ایک عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور اُس کے خلاف عمل بھی کرتے ہیں۔ یہ تناقض اور تضاد ہماری زندگی کے ہر معاملے میں پایا جاتا ہے خواہ وہ اہم ہو یا غیر اہم۔

مصر کی حیثیت

مثال کے طور پر مصر ہی کو لیجیے۔ یہ ملک اسلام کے ہر اجتماعی شعبے میں مسلم ممالک کی رہنمائی کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ہم اسلام کے بارے میں گفتگو کریں گے تو ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ ہم زندگی کے ہر گوشے پر نگاہ ڈالیں۔ کیونکہ اسلام زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اور اس طرح سے ہمیں آخرت کی کامیاب اور بابرکت زندگی سے ہمکنار کرتا ہے۔ ہماری حکومت، سیاست، معیشت اور معاشرت اگر اسلام کے اصولوں پر کاربند ہو تو یہ سب ویسی ہی عبادت ہے جیسی عبادت نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہے۔ اب ایک لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مصر عالم اسلام کا دل و دماغ ہے۔ دینِ اسلام اپنے اوّلین عہد میں آکر اس ملک میں مکین ہوگیا ہے۔ تیرہ سو سال سے زائد عرصہ گزرا جب مصر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اسلام سے مشرف ہوا۔ یہاں کے رہنے والوں نے اسلام کی دعوت پر اس طرح لبیک کہا کہ اب اس ملک میں سارے غیر مسلم پانچ فی صد سے زائد نہیں ہیں۔ اسی مصر میں جامعہ ازہر ہے جو دُنیائے اسلام کی سب سے بڑی اور قدیم ترین درسگاہ ہے اور علومِ اسلامیہ کی تعلیم و تدریس کے لیے مخصوص ہے۔ ساری دُنیا سے تشنگانِ علم یہاں کا قصد کرتے ہیں اور اسلامی علوم و معارف سے سیراب ہو کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس لوٹتے ہیں

تاکہ اپنے علمی سرمایے سے اپنے ہم وطنوں کو مستفید کریں۔ مدتہائے دراز سے یہ ملک اسلام کا قبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ یہی ملک ہے جس نے صلیبیوں اور تاتاریوں کے چھکے چھڑا دیے تھے اور جو ہمیشہ سے صیہونیت اور استعمار سے برسرِ پیکار رہا ہے۔ یہی ملک ہے جس نے اللہ اور اُس کے دین کے دشمنوں کے مکر و فریب اور اُن کی چالوں کو ہمیشہ ناکام بنایا ہے۔ یہ ملک ہر زمانے میں اسلام کا ماویٰ و ملجا، علماءِ مصلحین کا قبلہ اور دین کے مظلوم مجاہدین کی پناہ گاہ رہا ہے۔ پہلے زمانے میں بھی احیائے اسلام کے لیے تحریکیں یہاں سے برپا ہوتی رہی ہیں اور اس زمانے میں بھی اس ملک سے ایک اسلامی تحریک اٹھی ہے جو تجدیدِ دین کی قوی ترین اور عظیم ترین انقلابی تحریک ہے۔ یہ مصر سے نکلی ہے اور تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئی ہے۔ اس نے ان ممالک کے اسلامی عناصر کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کر دی ہے جس کا نصب العین اور لائحہ عمل ایک ہے اور جو ایک ہی قبلۂ مقصود کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے، قرآن جس کا دستور ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے پیشوا ہیں اور شہادت فی سبیل اللہ جس کی دلی تمنا ہے۔ خدا کی قسم "مومنین میں سے لوگ ہیں کہ جنھوں نے سچ کر دکھایا ہے اپنے وعدے کو جو انھوں نے اللہ سے کیا تھا۔ اُن میں سے کوئی ایسا ہے جس نے اپنی نذر پیش کر دی ہے

اور کوئی ایسا ہے جو ابھی منتظر ہے اور انھوں نے (اپنے وعدے میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔"[1]

مصر نے عہدِ قدیم اور عہدِ جدید میں اسلام کی جو خدمات سرانجام دی ہیں اور اس میں جو اسلامی فضا موجود رہی ہے اس کی وجہ سے یہ ملک مسلمانوں کی دینی تمناؤں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ اس ملک نے ہمیشہ اسلام کی مدافعت اور دنیا بھر میں اس کی اشاعت کا فریضہ ادا کیا ہے۔ آج بھی یہاں کے لوگ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سرگرم ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

اب دوسری طرف آپ دیکھیے کہ یہی مصر جو اسلام کی خدمت اور حفاظت کا مدعی ہے یہ جدید قوانین کو اپنا کر اسلام سے کیا معاملہ کر رہا ہے۔ یہ جدید قوانین اس نے فرانس سے مستعار لیے ہیں جو الحاد اور بے حیائی کا گڑھ ہے یا انگلستان

---

[1] یہ دراصل سورۂ احزاب کی ایک آیت کا ترجمہ ہے جسے مصنف نے نقل کیا تھا۔ آیت یہ ہے:- من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ۔ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔ ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہاں جماعت الاخوان المسلمون کا ذکر ہو رہا ہے جس کے رکن اور قائد عودہ شہید بھی تھے۔ قارئین نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ آیت مصنف مرحوم اور ان کے معظم رفقا پر کیسی صادق آتی ہے۔ کس طرح عودہ مرحوم یہ سطور لکھتے وقت ومنھم من ینتظر کی صف میں تھے اور کس طرح پھانسی کے تختہ پر لٹک کر وہ فمنھم من قضی نحبہ کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ رحمہ اللہ۔ (مترجم)

سے لیے ہیں جو بانت دن اسلام کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے
یا پھر اٹلی سے لیے ہیں جس کی ساری تاریخ اسلام کے خلاف ناکام جدوجہد
میں گزری ہے۔ یہ قوانین ایسی غیر مسلم اقوام سے اخذ کیے گئے ہیں جو مسیحیت
کے مدعی تو ہیں مگر حضرت مسیح کی تعلیمات سے بالکل عاری ہیں جو رسالتِ
مسیح پر ایمان لانے کا دعویٰ تو کرتی ہیں مگر درحقیقت شرک، کفر اور طغیان
پر اپنی پوری حیاتِ اجتماعی کو تعمیر کیے ہوئے ہیں۔ مصر ایک مسلمانوں کا
ملک ہے اور ایک مسلمان حکمران اس میں حکومت کر رہا ہے۔ ریاست کا
سرکاری دین اسلام ہے۔ ریاست کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ
شعائرِ اسلامی کی سرپرستی کرے، معابد و اوقاف کی نگہبانی کرے اور اسلامی
تعلیم و تہذیب کو زندہ رکھے۔ ریاست پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی گئی ہے
کہ وہ قومی سیاست، معاشرت، معیشت اور آداب و اخلاق کو اسلامی
اصولوں پر استوار کرے۔ یہ تمام امور ایک اسلامی ریاست کے خصائص
میں سے ہیں۔ لیکن ان تمام اعلانات کے باوجود مصری حکومت نے قوانینِ
موجودہ کی بدولت شریعتِ اسلامی کو معطل کر رکھا ہے اور اسلام کے حلال
کو حرام اور اسلام کے حرام کو حلال کر رکھا ہے۔

مصری حکومت نے ملک میں شرعی قوانین کے بجائے فرنگی قوانین
کو رائج کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ قوانین احکامِ اسلام کے مخالف ہیں اور

علمی وفنی لحاظ سے یہ اسلامی قوانین کا کسی حیثیت سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔
اس طرح اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے کے بجائے اس کی قبر کھودی جا رہی ہے
اور حکومتِ مصر دین کی اقامت و تجدید کے اس انوکھے اور اسلئے طریق سے
فتنہ برپا کرنے میں شرمائی، حالانکہ قرآن نے صاف کہا ہے کہ :

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (الجاثیۃ : ۱۸)

پھر ہم نے تمھیں امرِ دین کا ایک راستہ دکھا دیا ہے پس اس کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو جو نہیں جانتے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۔ (الاعراف : ۳)

پیروی کرو اس کی جو اتارا گیا ہے تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی نہ کرو۔ کم ہی تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (النساء : ۶۵)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم، نہیں وہ ایماندار ہو سکتے جب تک کہ وہ حکم نہ بنائیں تجھے آپس کے جھگڑوں میں۔ پھر نہ پائیں وہ اپنے دلوں میں تنگی اس چیز سے جو تم فیصلہ کرو اور سر تسلیم نہ کر لیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ۔

اور جنھوں نے فیصلہ نہ کیا اللہ کے نازل کردہ کے مطابق پس وہی لوگ کافر ہیں۔

اگر اللہ کے احکام یہ ہوں اور اسلامی ممالک کی حکومتوں نے انھیں معطل کر رکھا ہو تو ایسی حکومتوں کے بارے میں ہر عقلمند انسان خود آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے اور اسے یہ کہنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ حکومتیں مسلمانوں کو کفر کی طرف دعوت دیتی ہیں اور اس کے ارتکاب پر آمادہ کرتی ہیں۔

مصر میں محرمات حلال ہیں

مصری حکومت نے جس کا سرکاری دین اسلام ہے، سودی لین دین کی مختلف صورتوں کو حلال کر رکھا ہے۔ بلکہ پوری قوم میں اس بات کی تبلیغ کی جاتی ہے کہ رعایا سود سے اپنی دولت بڑھائے۔ حالانکہ اس حکومت کو معلوم ہے کہ اسلام نے سود کی ہر شکل کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ :-

أَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر اس طرح جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے شیطان

مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْٓا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (البقرۃ: ۲۷۵)

نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود کی مانند ہے حالانکہ حلال کیا ہے اللہ نے بیع کو اور حرام کیا ہے سود کو۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ: ۲۷۸)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی ہے سود میں سے اگر تم ایماندار ہو تو اعلان سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے ہیں تمہارے اصل زر۔ تم نہ ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

اسی مصر میں شراب، جوا اور لحم خنزیر حلال ہے اور حکومت نے مردوں اور عورتوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ ان محرمات کے استعمال اور ارتکاب کے لیے علانیہ مجالس قائم کریں اور سربازار ان کے لیے دکانیں سجائیں، حالانکہ اس حکومت کو یہ قرآنی حکم معلوم ہے کہ:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ

حرام کیا گیا ہے تم پر مردار اور خون اور خنزیر

الدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ۔ — کا گوشت۔

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ۔ (المائدۃ : ۹)

شراب، جُوا، اِستھان اور پانسے تو ناپاک اور شیطانی عمل سے ہیں۔ پس ان سے بچو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

کل مسکر خمر وکل مسکر حرام ما اسکر کثیره فقلیله حرام۔

ہر نشہ آور شے خمر ہے اور ہر نشہ آور شے حرام ہے۔ جو زیادہ مقدار میں نشہ پیدا کرے وہ تھوڑی مقدار میں بھی حرام ہے۔

لعن الله الخمر ولعن شاربها وساقيها وعاصرها ومعتصرها وبائعها ومبتاعها وحاملها والمحمولة اليه وأكل ثمنها۔

اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے شراب پر، اس کے پینے والے پر، پلانے والے پر، نچوڑنے والے پر، کشید کرنے والے پر، خرید و فروخت کرنے والے پر، اُٹھا کر لے جانے والے پر، جس تک پہنچائی جائے اُس پر اور اُس کی کمائی کھانے والے پر۔

حکومتِ مصر اس بات سے بھی نہیں شرماتی کہ شراب خرید کر اسے سرکاری اور پبلک تقریبات میں شرکا کے سامنے پیش کرے۔ اس طرح سے ہمارے حکمران اس لعنت کے مستحق بنتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یہی حکومتِ مصر اس بات کو جائز قرار دیتی ہے کہ رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوں اور ان میں غیر محرم مرد اور عورتیں بغلگیر ہو کر اور شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر نیم برہنگی کی حالت میں ناچیں۔ کیا یہ بے حیائی اور حرام کاری کی کھلم کھلا اشاعت نہیں ہے؟ کیا حکومت کو یہ قرآنی حکم معلوم نہیں ہے کہ:۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ إِنَّهُۥ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا۔	اور زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ یہ بے حیائی اور بہت برا راستہ ہے۔
(الاسرا: ۳۲)	
إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ	وہ لوگ جو پسند کرتے ہیں کہ پھیلے بے حیائی ان لوگوں میں جو ایمان لائے ہیں ان کے لیے عذاب ہے دردناک دنیا میں اور آخرت میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اسلام کی تعلیم تو یہاں تک ہے کہ اس نے زانی مرد کا پاک دامن

عورت سے اور زانیہ عورت کا نیکو کار مرد سے نکاح منع فرمایا ہے ۔ قرآن میں ہے :۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (النور ۳)	زانی نہیں نکاح کرتا مگر زانیہ اور مشرکہ سے اور زانیہ سے نہیں نکاح کرتا مگر زانی یا مشرک اور یہ مومنین پر حرام کر دیا گیا ہے

تعلیمِ دین کا فقدان

ریاستِ مصر کا دین اسلام ہے اور اسی مصر میں انگریز، فرانسیسی اور اطالوی مشنریوں کو اذنِ عام ہے کہ وہ اس ملک میں تبلیغی مراکز قائم کریں اور مسلمان بچوں کو بے دین بنائیں لیکن سرکاری مدارس میں دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے ۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ سے انھیں روشناس نہیں کرایا جاتا لیکن یورپ کے ممالک کی تاریخ بڑے اہتمام سے طلبا کو پڑھائی جاتی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی بنیاد کلمۂ شہادت، اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، صومِ رمضان اور حجِ بیت اللہ پر رکھی گئی ہے ۔ کیا ہماری حکومت کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اسلام کی ان بنیادوں کی ہر مسلمان کو تعلیم دینا اس پر واجب ہے ۔ کتاب اللہ میں وارد ہے :۔

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْہُمْ	کیوں نہ نکلی ہر گروہ میں سے ایک جماعت

طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ۔

گروہ سمجھ پیدا کرنے دین میں اور ڈراتے اپنی قوم کو جب لوٹتے اُن کی طرف۔

(التوبة : ١٢٢)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

مَنْ يرد الله به خيرا يفقهه في الدين۔

جس کے ساتھ ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ خیر کا اُسے سمجھ عطا کرتا ہے دین کی۔

ماعُبد الله تعالیٰ بشيء افضل من فقه في الدين ولفقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد ولكل شيء عماد وعماد هٰذا الدين الفقه وخير دينكم ايسره وخير العبادة الفقه

نہیں عبادت کی جاتی اللہ کی کسی شے سے جو افضل ہو دین کی سمجھ سے۔ دین کی سمجھ رکھنے والا ایک شخص زیادہ بھاری ہوتا ہے شیطان پر ہزار عابد سے۔ ہر شے کا ایک ستون ہوتا ہے اور اس دین کا ستون اس کی سمجھ ہے۔ تمہارا سب سے اچھا دین وہ ہے جو آسان ہو اور سب سے اچھی عبادت دین کی سمجھ بوجھ ہے۔

داعیانِ اسلام کی مظلومیت

یہی مصر کی "اسلامی حکومت" ہر اُس شخص کے خلاف محاذ قائم کر لیتی ہے جو صحیح اسلام کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے اور حکومت کو اس کی ضلالت آمیز اور گمراہ کُن کارروائیوں سے روکتا ہے۔ یہ حکومت اپنے فاسقانہ قوانین کو ایسے لوگوں کے خلاف حرکت میں لاتی ہے، ان کی زبان بندی و قلم بندی کرتی ہے اور انھیں جیلوں میں ٹھونس کر انواع و اقسام کے عذاب کا نشانہ بناتی ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ یہ لوگ اپنے اسلام میں مخلص ہیں اور یہ ٹھنڈے دل سے اس صورتِ حال کو گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی مسلمان غیر اسلامی حرکات کا مرتکب ہو۔ کیا اس حکومت کو معلوم نہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلم پر از روئے اسلام واجب ہے اور منکر کو حسبِ استطاعت مٹانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۔(آل عمران:۱۰۴)

اور چاہیے کہ ہو تم میں ایک اُمت جو بلائے خیر کی طرف حکم دے معروف کا اور روکے منکر سے

ہم پہلے معروف اور منکر کی تعریف بھی بیان کر چکے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی نقل کر چکے ہیں کہ:۔

من رأى منكم منكرا فليغيّره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذالك اضعف الايمان۔

قوانینِ شرعیہ سے انحراف

ہماری حکومت اسلام کے تقاضوں کو اس طریق سے پورا کر رہی ہے کہ اسلام کے ایک ایک حکم سے روگردانی اختیار کی جا رہی ہے۔ چونکہ زکوٰۃ کو اسلام نے فرض قرار دیا ہے اس لیے اس کے قوانین کو معطّل کر دیا گیا ہے لیکن بیسیوں یورپین اور امریکی قوانین کو یہاں رائج کیا گیا ہے حالانکہ یہ بالکل ممکن تھا کہ ان کی جگہ پر انہی جیسے بلکہ ان سے افضل قوانین شریعت سے اخذ کر کے نافذ کیے جاتے۔ شرعی عدالتوں کے دائرۂ اختیار کو روز بروز اسی لیے تنگ کیا جا رہا ہے کہ وہ احکامِ اسلامی کے نفاذ کا ایک ذریعہ ہیں[1]۔ اسلامی قانون و فقہ کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کی تجویز عرصہ سے زیرِ غور تھی۔ اس کے لیے کئی مرتبہ بجٹ میں گنجائش بھی رکھی گئی، مگر اُسے بار بار نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اُس کے بارے میں بھی یہ خدشہ ہے کہ وہ قوانینِ شرعیہ کی ترویج و تقویت کا موجب ہو گا۔ ہماری حکومت کے لیے اسلام کے قوانین کو چھوڑ کر کفر و ضلالت کے قوانین کو اختیار

---

[1] مصر کی موجودہ فوجی حکومت نے شرعی عدالتوں کے وجود کو کلیۃً مٹا دیا ہے (مترجم)۔

کر لینا کتنا آسان ہے لیکن کافرانہ قوانین کو چھوڑ کر اسلامی قوانین کی طرف آنا اُس کے لیے کتنا مشکل ہے؟ کیا اس حکومت کو معلوم نہیں ہے کہ شرک کا استیصال اور اسلام کا قیام از روئے قرآن اسلامی حکومت کا اوّلین فریضہ ہے اور اس پر واجب ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ تعلیمات کی روشنی میں سارے معاملات طے کرے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وعدہ کیا ہے اللہ نے اُن لوگوں سے جو
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	ایمان لائے ہیں تم میں سے اور عمل کیے ہیں
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ	اچھے، ضرور جانشین کرے گا انھیں زمین میں
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ	جس طرح جانشین کیا اُن لوگوں کو جو اُن سے
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ	پہلے تھے اور ضرور طاقت دے گا اُن کے
لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى	لیے اُن کے دین کو جو اُس نے پسند کیا ہے
ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	اُن کے لیے اور ضرور بدل دے گا اُن کے
مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا	خوف کو امن سے عبادت کرتے ہیں میری
يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ	نہیں کرتے میرے ساتھ کسی کو شریک۔
بِىْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ	اور جو کفر کرے اس کے بعد پس وہی لوگ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	فاسق ہیں۔
الْفٰسِقُوْنَ۔ (النور: ۵۵)	

اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ۔ (الحج : ۴۱)

وہ لوگ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشتے ہیں تو نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور اللہ کے لیے ہے معاملات کا انجام۔

مصر کی غلامی کا باعث

مصر ابھی تک آزادی اور استقلال کی تلاش میں ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اس ملک نے کس کس طرح آزادی کے لیے جدوجہد کی ہے اور کس طرح اسلام سے اعراض وانحراف کی بنا پر اسے اس جدوجہد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں ہمارے ہاں ایک داخلی فتنہ اٹھ کھڑا ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز ۱۸۸۲ء میں خدیو مصر کی حمایت اور رعایا سے اسے بچانے کے بہانے مصر میں آگھسے وہ اس سے پہلے بارہا مصر میں داخل ہونے کی کوشش کرتے رہے لیکن انھیں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ مصر اور فرانس کی جنگ کے بعد انگریزوں نے دو مرتبہ مصر میں قدم جمانے کی سعی کی لیکن دونوں مرتبہ انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ محمد علی پاشا کے زمانے میں انھوں نے ایک مرتبہ پھر مصر میں درآنے کی کوشش کی لیکن ہم نے

انھیں دھکیل کر سمندر کی جانب پھینک دیا۔ چنانچہ وہ نامراد اور رسوا ہو کر اپنے گھر لوٹ گئے اور اس بات سے قطعاً مایوس ہو گئے کہ وہ طاقت کے بل پر کبھی مصر میں داخل ہو سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے روباہی مکر و فریب سے کام لینا شروع کیا اور سازشوں کا جال بچھا کر موقع کا انتظار کرنے لگے۔ آخر کار ہنگامہ عرابیہ نمودار ہوا۔ انگریزوں نے خود اس کے لیے فضا کو سازگار بنایا اور اس کے شراروں کو اس حد تک ہوا دی کہ اس آگ کے شعلے پوری طرح بھڑک اٹھے۔ انگریز دوبارہ قیام امن کا دعویٰ لے کر مصر میں آ دھمکے لیکن ان کا اصل ارادہ یہ تھا کہ مصر پر تسلط جما لیں اور اس کی گردن پر سوار ہو کر ہمیشہ کے لیے بیٹھ جائیں۔ انھوں نے بیسیوں مرتبہ یہ اعلان کیا کہ مصر میں ان کا قیام عارضی ہے اور وہ بہت جلد اسے خالی کر دیں گے لیکن انھوں نے ہمیشہ کذب بیانی اور وعدہ خلافی سے کام لیا۔ یہ لوگ مصر میں بیٹھ کر مصر کو لوٹتے رہے، مصریوں کا خون نچوڑتے رہے اور اہل ملک کی عزت و آبرو سے کھیلتے رہے۔

جب ان بحری قزاقوں کے ارادے بالکل آشکارا ہو گئے تو پوری قوم ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور ابنائے مصر نے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کا عزم کر لیا۔ ہمارے لیڈروں اور حکمرانوں نے اس نصب العین کے لیے قوم کی رہنمائی کا اعلان کیا۔ لیکن ان حکمرانوں نے حصول آزادی کے لیے

منّت سماجت، عجز و نیاز اور بھیک منگوں کا سا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے حقوق غصب کرنے والوں سے اس بات کی توقعات وابستہ کیں کہ ان کے اندر انصاف کا جذبہ بیدار ہو کر خود ہی انھیں ظلم سے باز آنے پر مجبور کر دے گا۔ اس خوش فہمی کے بارے میں جو کم سے کم بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سراسر سادہ لوحی پر مبنی ہے اور اس خام خیالی میں وہی مبتلا ہو سکتا ہے جو تاریخ اور فطرتِ انسانی سے بالکل نابلد ہو۔ اگر غاصب کے اندر عدل و انصاف کا کچھ بھی احساس ہوتا تو دنیا استعمار، استبداد اور انتداب کی مختلف صورتوں سے بالکل نا آشنا ہوتی۔ حصولِ آزادی کے بارے میں مصری حکومت کا یہ رویّہ عقل و فطرت ہی کے خلاف نہیں تھا بلکہ اسلامی تعلیمات کے بھی قطعی خلاف تھا۔ اگر ہمارے حکمران فطرتِ سلیمہ اور دینِ اسلام سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو راہِ حق ان پر منکشف ہو جاتی اور انھیں معلوم ہو جاتا کہ جہاد بالسیف ہی آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ عقل و فطرت کے تقاضوں کا احکامِ اسلام کے مطابق ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے)۔ اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اسے دینِ فطرت کا نام دیا ہے۔

وضعی قانون کے تلخ ثمرات

مصر میں قوانین موضوعہ کے رائج و نافذ ہونے سے جو مفاسد و مضرات رونما ہوئے ہیں، وہ کسی صاحبِ فہم اور صاحبِ احساس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان قوانین نے ہمارے معاشرے کو قطعی طور پر غیر اسلامی سانچوں میں ڈھال دیا ہے اور اب اس میں اسلام کی بو تک باقی نہیں ہے۔ ہمارے حکام، زعما اور اصحاب الرائے کے مابین اب اتحاد اور تعاون مفقود ہو گیا ہے۔ وہ گروہ در گروہ مختلف ٹولیوں میں بٹ چکے ہیں اور تشتت و افتراق کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے خلاف سازش میں مصروف ہے اور الزام تراشی کرنے میں حق و باطل سے بالکل عاری ہے۔ سب و شتم اور گالم گلوچ ان کا شیوۂ عام اور تکیۂ کلام بن چکا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی تحقیر و توہین کے درپے ہے اور ہر فرد دوسرے فرد کے کاسۂ سر کو اپنے لیے زینۂ اقتدار کے طور پر استعمال کرنے کی فکر میں ہے۔ مکروہ مقاصد کے حصول کے لیے طریقے بھی ایسے گھناؤنے اختیار کیے جاتے ہیں جن سے اسلام کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ہر ایک کی عزت و ناموس کے پیرہن کو تار تار کر دیا ہے۔ اور بعد میں آنے والوں کے لیے سیرت و کردار کا بدترین نمونہ پیش کیا ہے۔

وہ عدل جس کی ترازو کا تول قریب و بعید اور دوست دشمن سب کے

لیے یکساں اور بے لاگ تھا، وہ عدلِ مستقیم اب بلادِ اسلامیہ کو داغِ مفارقت دے گیا ہے۔ اس عدل و انصاف کا ہمارے ہاں صرف نام باقی رہ گیا ہے ورنہ درحقیقت اس کی جگہ باہمی ظلم، منافرت اور بے اعتمادی نے لے لی ہے۔ ہر سیاسی گروہ دوسرے کو نیچا دکھا کر خود مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے کے لیے کوشاں ہے۔ ہر جانشین اپنے پیشرو کے مقابلے میں بدتر اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے اور اگر اسے ٹوکا جاتا ہے تو اپنے بُرے اسلاف کی برائیوں کو بطورِ دلیل پیش کرتا ہے۔ اس طرح ایک بدکرداری سے دوسری بداعمالی کے حق میں سندِ جواز فراہم کی جاتی ہے۔ اس طرح ہم فسادِ اخلاق اور ضعفِ ایمانی کی تاریک ترین گہرائیوں میں گھر چکے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی عقیدہ و اصول ایسا باقی نہیں رہا جس کی پابندی لازمی سمجھی جاتی ہو۔ نفسانی خواہشات ہماری معبود ہیں اور فوائد و منافع سمیٹنا ہمارا نصب العین ہے۔ اُفقِ اقتدار پر جو سورج بھی نمودار ہوتا ہے لوگ اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور جب وہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اُس کی طرف پیٹھ پھیر کر اسے تمسخر کا نشانہ بنا لیا جاتا ہے۔

صاحبِ قیادت طبقہ چونکہ ریا اور بداخلاقی میں مبتلا ہے، اس لیے ساری قوم میں ریاکاری اور اخلاقی بے راہ روی عام ہو چکی ہے۔ صرف ایک قلیل گروہ ہی ایسا ہے جس میں کچھ اخلاق اور تقویٰ کی رمق باقی رہ گئی ہے۔

مزید رونا جس چیز کا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا نوجوان اور فعال طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ترقی اور تمدن اس شے کا نام ہے کہ انسان شرافت ضمیر، احساس ذمہ داری شفقت غرضیکہ انسانیت کے ہر جوہر سے عاری ہو جائے۔ شریف اور بھلے آدمیوں کو دیکھ کر کہہ دیا جاتا ہے کہ ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

ملت کے یہ نونہال دین و ایمان اور علم و عمل سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ یہ ہر وقت کنگھی اور آئینہ لے کر اپنی نوک پلک سنوارنے اور اپنی پوشاک کو آراستہ کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کے لباس میں اور ایکٹرسوں اور ایکٹرسوں کے لباس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا ہے۔ ان کی لگام ان کی شہوات کے ہاتھ میں ہے جو انھیں گلی گلی اور کوچے کوچے رسوا کرتی پھر رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر کمیونزم کا نہایت سہل شکار بن رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں گھر میں ایسی تربیت اور مدرسے میں ایسی تعلیم نہیں حاصل ہوئی ہے جو انھیں تخریبی اور مفسدانہ افکار اور ملحدانہ نظریات سے بچا سکتے۔ آج ابنائے قوم کے لیے ہر وہ حرکت روا ہو گئی ہے جو انھیں اپنے رذیل مقاصد تک پہنچانے میں مددگار بن سکے۔ چنانچہ چوری، رشوت، غصب غبن، ضمیر فروشی بلکہ ملت فروشی تک کو جائز اور مباح ٹھہرا دیا گیا ہے بشرطیکہ اس کے عوض مال، جاہ اور اقتدار کی کرسی ملنے کی توقع ہو۔

ہر شخص کے اندر دوسروں کے بالمقابل رشک کے جذبہ کے بجائے حسد کی آگ بھڑک رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ دوسرے کے پاس ہے کاش کہ وہ سب مجھے مل جائے۔ کسان زمیندار سے حسد کر رہا ہے، مزدور کارخانہ دار سے حسد کر رہا ہے اور غریب امیر کے خلاف حسد میں مبتلا ہے۔ حاسد کی تمنا یہ ہے کہ جو کچھ محسود کے پاس ہے کاش کہ وہ مجھے مل جائے، خواہ یہ ناحق اور غیر مشروع طریق ہی سے اور بغیر کسی جدوجہد ہی کے کیوں نہ ہو۔ ایک طرف دولت کی اتنی ریل پیل ہے کہ اغنیا اس میں مست اور غرق ہیں۔ دوسری طرف فقر و افلاس کی ایسی شدت ہے کہ فقرا پہ فاقہ کشی اور جانکنی کا عالم طاری ہے لیکن دولت کے پرستاروں میں یہ احساس قطعاً باقی نہیں ہے کہ محتاجوں اور بے نواؤں کا جو حق شریعت نے مقرر کیا ہے اسے ادا کریں ؎

کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

قوانینِ مروجہ بھی فقرا و مساکین کو ان کا حق دلوانے سے عاجز ہیں۔ بلکہ یہ قوانین تو اُلٹا سرمایہ داروں کی پشت پناہی اور تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ ایک جانب وہ متمول افراد ہیں جو جائداد، تجارت اور صنعت پر قابض ہیں، دوسری جانب محنت کار ہیں جو خون پسینہ ایک کرتے ہیں مگر اس کا معاوضہ انھیں اتنا بھی نہیں ملتا کہ وہ سوکھے ٹکڑوں سے پیٹ

پال سکیں یا پھٹے پرانے چیتھڑوں ہی سے اپنا ستر چھپا سکیں۔ اسلام کے وہ قوانین معطل ہیں جو اغنیا سے فقرا کا حق وصول کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک مال و دولت سے اپنے کھیتے بھر رہا ہے اور دوسرا نفرت حسد اور کینے سے اپنے سینے کو معمور کر رہا ہے اور اس نفرت و حقارت میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

ہمارے قوانینِ اجتماعی کی بنیاد صرف جلبِ منفعت اور بے قید معیشت پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے چھوٹوں کے اندر بڑوں کے لیے توقیر کا جذبہ ناپید ہے اور بڑوں کے اندر چھوٹوں کے لیے شفقت و محبت کا داعیہ مفقود ہے۔ قوی ضعیف پر رحم نہیں کھاتا اور غنی کو فقیر پر ترس نہیں آتا۔ حاکم رعایا کی نگاہ میں مبغوض ہے اور رعایا حاکم کی نظر میں مقہور ہے۔ ہمارا عائلی نظام بھی مختل اور معطل ہو چکا ہے۔ میاں بیوی سے جدا ہے، بیٹا باپ سے متنفر ہے اور بھائی بھائی سے دور ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ ہماری زندگی کی بنیادیں ہی نفع اندوزی اور خود غرضی پر استوار کی گئی ہیں۔ آج ہماری حکومت کا نظام ہی درہم برہم ہو چکا ہے اور آج مصر میں ہر شے بکاؤ مال ہے، ہر چیز نیلام ہو رہی ہے۔ مسندِ حکومت کی بھی ایک قیمت ہے، قوت و شرافت کی بھی ایک قیمت ہے اور ضعف و دناءت کی بھی ایک قیمت ہے۔ ہر شخص جو یہاں حق یا باطل کے لیے کوئی عمل سر انجام دینا

چاہتا ہے وہ اپنے عمل کا پیشگی معاوضہ وصول کرنے کے درپے ہے۔ پس اس دیار میں بدنصیب اور محروم وہ افراد ہیں جو شرافت و آدمیت کی قیمت درہم و دینار کی شکل میں چکانے سے عاجز ہیں یا اس سودے کے لیے تیار نہیں ہیں!

شرمناک حوادث

آئے دن ہمارے مصر میں ایسے شرمناک واقعات واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک واقعہ قیامت تک کے لیے ہمارے سر خجالت سے جھکا دینے کے لیے کافی ہے۔ میرے سامنے ایک ہی دن کے اخبارات ہیں، جن کے صفحات سات ایسے گھناؤنے واقعات سے سیاہ ہیں: فوجی مقدمات کا قضیہ۔ صحرائے غربی سے ناجائز اسلحہ کی برآمد کا قضیہ۔ راشن کے محکمے میں چائے، قہوہ اور لکڑی وغیرہ کے سمگلنگ کا قضیہ۔ وزارتِ تعلیم کے غبن کا قضیہ۔ اسرائیل کو موٹریں بھیجنے کا قضیہ۔ محکمۂ صحت کے فنڈز میں خرد برد کا قضیہ اور جیل خانوں میں حوالاتیوں کی تعذیب اور ایذا رسانی کا قضیہ جس کے بیان سے زبان عاجز ہے بلکہ جس کے تصور سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یوں تو ان شرمناک حوادث میں سے ہر ایک حادثہ ملک کی عزت و شہرت کے دامن پر نہایت بدنما داغ ہے، لیکن ان میں سب سے آخری

اذیت دہی کا سانحہ ایسا ہے کہ یہ مادرِ وطن کی پیشانی پر سب سے بڑا کلنگ کا ٹیکہ ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار نے اپنے دین و ایمان کو کھو دیا ہے، امانت میں خیانت کی ہے اور ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جو نہ کبھی بھلایا جا سکتا ہے اور نہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ ایک ملزم محض ایک الزامِ جرم کا مورد ہوتا ہے اس کے خلاف جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اسے ڈرانے، دھمکانے یا عذاب دینے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس سے محض پوچھ گچھ اور تحقیق کی جا سکتی ہے۔ حکمرانوں کے ہاتھ میں طاقت خدا کی اور قوم کی ایک امانت ہے اور ایک ملزم بھی ان کے ہاتھ میں امانت ہے۔ اگر وہ مار پیٹ کر اعترافِ جرم کرانے کی کوشش کریں تو وہ خود جرمِ خیانت میں ماخوذ ہیں کیونکہ انھوں نے عدل و انصاف کی ضمانت کو اپنے ہی ہاتھوں ضائع کر دیا۔ پھر اگر تعذیب کے ایسے واقعات اکا دکا اور انفرادی ہوں تو درگزر کے قابل ہو سکتے ہیں لیکن اگر پوری حکومت کی مشینری اس فعلِ شنیع کو نظر انداز کرے بلکہ اس کی پشت پناہی کرے اور پولیس کو خود انواع و اقسام کے عذاب دینے پر آمادہ کرے تو یہ ایک سنگین، ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ عفو جرم ہے۔

حکومت کی آنکھوں کے سامنے اور ان کی ناک کے نیچے اگر ایسے مظالم دن رات، ہفتوں تک، مہینوں تک بلکہ سالہا سال تک توڑے جائیں

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک سے انصاف کا جنازہ اٹھ گیا اور نظام وقانون رخصت ہو گیا۔ ایسے ملک میں گویا درندے بستے ہیں جو چار سُو شکار کرتے پھرتے ہیں۔ وہ وحوش ہیں جن کی ناک میں اپنی خواہشات کی نکیل پڑی ہوئی ہے اور یہی حیوانات ہیں جن کے ہاتھ میں انسانی حقوق کے ناپ تول کے لیے میزان عدل تھما دی گئی ہے۔

ان واقعات نے ہمارے ملک کی عزت وناموس کو مجروح کر دیا ہے اور ہماری بین الاقوامی شہرت ونا موری پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ابنائے وطن میں سے ایک ایک فرد پر وطن کا یہ حق ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور اُس وقت تک نہ بیٹھے جب تک یہ شرمناک صورتِ حال ختم نہ ہو جائے اور ہر خائن ومجرم کو اُس کے جرم کے ارتکاب یا مجرم سے اعراض واغماض کی سزا نہ مل جائے یہاں ایسا فساد برپا ہو چکا ہے جو تباہ کن ہے۔ ایسی اباحیت پھیل گئی ہے جو مہلک ہے۔ ایسے ظلم وا ہوا پرستی کا دور دورہ ہے جس سے ہماری وحدت و سالمیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ یہاں فقراء واغنیا کے مابین کارخانہ دار اور محنت کار کے مابین، زبردست اور زیر دست کے مابین حاکم اور محکوم کے مابین ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ باہمی تعاون کی جگہ تنافر وتصادم نے لے لی ہے۔ مصر جس ہلاکت کے گڑھے میں گرا چاہتا ہے اُس سے اُسے صرف اسلام ہی بچا سکتا ہے کیونکہ اسلام احیائے نفوس تطہیرِ قلوب اور

اصلاح احوال کا ضامن ہے اور وہی اس امر کا کفیل ہے کہ قوم کو امن و سلامتی سے ہم کنار کرے۔

فریضۂ جہاد

اسلام میں ذلت گوارا نہیں

اسلام کبھی اسے پسند نہیں کرتا کہ مسلمان دب کر رہیں۔ ایک مسلمان نرمی اور عاجزی صرف اپنے مسلمان بھائی کے بالمقابل ہی اختیار کر سکتا ہے۔ اسلام کے دشمنوں کے لیے وہ نرم چارہ نہیں ہے۔

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ۔ (المائدۃ)

مومنین کے مقابلے میں نرم ہیں، کافروں کے بالمقابل سخت ہیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (الفتح)

محمد اللہ کے رسول اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔

حقیقت میں مسلمانوں کا مقام دُنیا میں ذلت کا نہیں بلکہ عزت اور

غلبے کا ہے :۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

اور اللہ کے لیے ہے عزت اور اس کے رسولؐ کے لیے اور مومنین کے لیے لیکن منافقین جانتے نہیں۔

(المنافقون)

اسلام نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اپنے اس مقامِ عزت پر یقین و اعتماد رکھیں اور اس امر کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں کہ وہ اللہ کے وعدے کو سچا ثابت کر دکھائیں گے اور اپنی اُمت کو اس مقام پر فائز کریں گے جو اللہ نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے۔ یہ مقام درحقیقت دُنیا کی تعلیم و ہدایت اور امامت و قیادت کا مقام ہے۔

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

اسی طرح بنایا ہے ہم نے تمھیں ایک بیچ کی اُمت تاکہ تم بنو گواہ تمام لوگوں پر۔

(البقرۃ: ۱۴۳)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آلِ عمران: ۱۱۰)

تم ایک بہترین اُمت ہو جو تشکیل کی گئی ہے تمام لوگوں کے لیے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو بُرائی سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

اسی تعلیم کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ جس سرزمین میں اُسے عزت اور سرفرازی کا مقام حاصل نہ ہو اور نہ ہی وہاں ایسے اسباب مہیا ہو سکتے ہوں جن سے مسلمان کو عزت و تمکین حاصل ہو سکتی ہو، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی سرزمین کی جانب ہجرت اختیار کرے جہاں ایسے اسباب فراہم ہوں یا فراہم ہو سکنے کی توقع ہو۔ ایسے شخص کے لیے اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ اُسے زمین میں قرار اور ٹھکانا نصیب ہوگا اور اگر اس کی تلاش میں اُس کی زندگی ختم ہو جائے گی تو اس کا اجر اللہ کے ہاں ضائع نہ ہوگا۔

ہجرت

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور جو ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں، پائے گا
يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا	زمین میں ٹھکانا بہت اور فراخی اور جو کوئی
كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ	نکلے اپنے گھر سے مہاجر بن کر اللہ اور اس
مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ	کے رسولؐ کی جانب پھر آلے اُسے موت
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	پس ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ پر۔
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ	

(النساء : ۱۰۰)

اگر ایک مسلمان ذلت اور ضعف پر راضی اور قانع ہو جائے، حالانکہ وہ ہجرت کی قدرت رکھتا ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے۔ اسلام کا

دعوی اُس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے ذلت و مسکنت کے طوق کو خود گلے میں ڈالا ہے۔ اسلام نے ہرگز اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس خواری اور رُسوائی میں مبتلا رہے۔ اسلام نے مسلمان کو حتی الوسع غیر مسلموں کے معاشرے میں رہنے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ کمزوری کی علامت ہے اور ایسی حالت میں مسلمان کو غیر مسلموں کا تابع بن کر رہنا پڑتا ہے حالانکہ مسلمان سوائے اللہ کے کسی کا تابع نہیں ہو سکتا۔

قرآن کا ارشاد ہے:۔

أَلَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	وہ لوگ جن کی رُوح قبض کر رہے تھے
ظَالِمِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ	فرشتے جبکہ وہ ظلم کرنے والے تھے اپنی
كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ	جانوں پر۔ کہا (فرشتوں نے) کس حال میں
فِي الْأَرْضِ۔ قَالُوْٓا أَلَمْ تَكُنْ	تھے تم۔ کہا اُنھوں نے، تھے ہم کمزور بنا
أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا	دیئے گئے زمین میں۔ اُنھوں نے کہا "کیا
فِيْهَا فَأُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ	نہیں تھی زمین اللہ کی وسیع کہ تم ہجرت کر جاتے
وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ إِلَّا	اُس میں" پس یہی لوگ ہیں ٹھکانا ہے اُن کا جہنم
الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ	اور بُرا ٹھکانا ہے مگر وہ لوگ جو کمزور ہیں مرد
وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا	اور بچوں میں سے کہ نہ تو چارہ کار رکھتے ہوں
يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ	اور نہ راہ پاتے ہوں پس قریب ہے

لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔

کہ اللہ تعالیٰ اُن سے درگزر فرمائے اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

(النساء:۹۷)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

أنا برئ من كل مسلم يقيم بين اظهر المشركين قيل يا رسول الله ولم؟ قال لا تترائى نارا هما۔

میں بری الذمہ ہوں ہر اُس مسلمان سے جو مشرکین کے اندر مقیم رہے۔ عرض کیا گیا یا رسُول اللہ! کس لیے؟ آپ نے فرمایا کہ اُن کے چُولھے آمنے سامنے نہیں ہو سکتے۔ (یعنی ان کی معاشرت اور رہن سہن بالکل الگ الگ ہونا چاہیے)

من جاء مع المشرك و سكن معهٗ فهو مثلهٗ۔

جس شخص کی آمد و رفت اور سکونت مشرک کے ساتھ رہی وہ اُسی کی مانند ہے۔

لا تنقطع الهجرة حتّٰى تنقطع التوبة ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس في مغربها۔

ہجرت ختم نہیں ہوگی جب تک توبہ نہ ختم ہو اور توبہ نہیں ختم ہوگی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے۔

اسلام ظلم سے مصالحت نہیں کرتا

اسلام اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ ظالم اور زیادتی کرنے والے کے مقابل میں خاموش رہا جائے اور برائی کے سامنے سر جھکا دیا جائے اسلام ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ ہم اقوام یورپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور جو مظالم وہ اسلامی ممالک پر ڈھا رہے ہیں ہم اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں۔ ضروری ہے کہ طاقت کا جواب طاقت سے دیا جائے تلوار کا مقابلہ تلوار سے کیا جائے، حتیٰ کہ ہمارے غصب کردہ حقوق ہمیں واپس مل جائیں ہمارے دشمن ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں اور ہمارے ممالک میں اقتدار خالص اسلام اور مسلمانوں کے قبضے میں آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔ (البقرۃ: ۱۹۴)

ماہ حرام کے بدلے ماہ حرام ہے اور حرمتوں میں بدلہ ہے۔ پس جو کوئی زیادتی کرے تم پر۔ تم زیادتی کرو اس پر اتنی جتنی زیادتی کی ہے اس نے تم پر۔

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (شوریٰ: ۴۰)

برائی کا بدلہ برائی ہے اتنی ہی۔

جہاد فرض ہے اسلام کے دشمنوں سے جہاد اللہ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے اور جہاد میں ہر طرح کی مالی اور جانی قربانی اور جدو جہد شامل ہے، قرآن میں جہاد پر بار بار زور دیا گیا ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (البقرۃ: ٢١٦)	تم پر فرض کیا گیا ہے لڑنا اور وہ ناپسند ہے تمھیں اور شاید کہ تم ناپسند کرو ایک چیز کو اور وہ بہتر ہو تمھارے لیے۔
وَقَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ۔	اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن سے جو لڑتے ہیں تم سے
وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (الانفال: ٣٩)	اور جنگ کرو اُن سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ اور ہو جائے دین سارے کا سارا اللہ کے لیے۔
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَأَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ۔ (البقرۃ: ١٩١)	اور قتل کرو انھیں جہاں پاؤ تم انھیں اور نکالو انھیں جہاں سے انھوں نے نکالا ہے تمھیں۔
فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ	پس لڑنا چاہیے اللہ کی راہ میں اُن لوگوں کو جو بیچتے ہیں دنیا کی زندگی کو آخرت

الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ (النسا: ٧٤) کے عوض۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ (النساء: ٧٤)

اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ نہیں لڑتے تم اللہ کی راہ میں اور کمزور مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا اَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ ۔ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۔ (النساء: ٧٦)

وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو لوگ کافر ہوئے ہیں لڑتے ہیں طاغوت کی راہ میں پس جنگ کرو شیطان کے دوستوں سے۔ یقیناً شیطان کی چال ضعیف ہوتی ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (التوبة: ٤١)

نکلو ہلکے پھلکے اور ساز و سامان لے کر بھی اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کے رستے میں۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً

اور سارے کے سارے قتال کرو مشرکین

كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً۔ (التوبة: ۳٦)

ہے جس طرح وہ قتال کرتے ہیں تم سے سارے کے سارے۔

وَقَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (التوبة: ۲۹)

لڑو اُن لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یومِ آخر پر اور نہیں حرام سمجھتے اسے جسے حرام کیا ہے اللہ اور اُس کے رسولؐ نے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الصف: ۲۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو کیا میں تمھیں بتاؤں وہ تجارت جو نجات دے تم کو دردناک عذاب سے۔ تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

فقہا کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جہاد کن حالات میں فرضِ عین ہے اور کن حالات میں فرضِ کفایہ ہے لیکن مندرجۂ ذیل صورتوں میں جہاد بالاتفاق فرضِ عین ہے

(۱) جب لشکرِ اسلام اور لشکرِ کفار میدانِ جنگ میں باقاعدہ صف بند ہو کر ڈٹیں، تو ایسی لڑائی میں آخر دم تک لڑنا فرضِ عین ہے اور سپہ سالار کی اجازت کے بغیر پیٹھ پھیرنا حرام ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا۔	اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو جب کسی لشکر سے تمہاری مُٹھ بھیڑ ہو تو ڈٹ جاؤ۔
(الانفال: ۴۵)	
يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ۔	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم مقابلہ کرو اُن لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا ہے مورچہ جما کر اور صفیں باندھ کر تو پھر پیٹھ مت موڑو۔
(انفال: ۱۵)	

(۲) جب امام مسلمین کی طرف سے نفیرِ عام ہو جائے یعنی ہر قابلِ جنگ مرد کو لڑنے کی دعوت دے دی جائے تو ایسی صُورت میں بھی جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ۔	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے نکلو اللہ کی راہ میں تو تم زمین کے ساتھ لگے جا رہے ہو۔
(التوبۃ: ۳۸)	

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

إذا استنفرتم فانفروا — جب تمھیں نکلنے کے لیے کہا جائے تو نکلو

(۳) جب کفار کسی اسلامی ملک میں داخل ہو جائیں تو وہاں کے تمام باشندوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ اور اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ بلادِ اسلامیہ کفار کے زیر تسلط ہوں۔ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کفار دارالاسلام کی کسی غیر آباد اور ویران جگہ پر بھی قابض ہوں تب بھی اُن کے خلاف جہاد فرض ہے۔ بعض فقہا کا خیال ہے کہ کفار کے ملک کے اندر گھس آنے پر بوڑھوں، عورتوں، مریضوں اور معذوروں پر بھی جہاد فرض ہو جاتا ہے حالانکہ بالعموم عورتوں کو اس خدمت سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ "یا رسول اللہ، کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے تو آپؐ نے فرمایا تھا" جہاد لا قتال فیه - الحج والعمرة " (عورتوں کے لئے ایسا جہاد ہے جس میں قتال نہیں ہے۔ یعنی حج اور عمرہ)۔

جہاد کے لئے دائمی تیاری

مسلمانوں پر صرف یہی فرض نہیں ہے کہ وہ جنگ کی پکار پر لبیک کہیں اور موقع آنے پر قدم پیچھے نہ ہٹائیں، بلکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر

وقت جہاد کے لیے آمادہ رہیں، کیل کانٹے سے لیس رہیں اور فوجی طاقت اس حد تک فراہم کر رکھیں کہ دشمن مرعوب رہے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آنے پائے۔

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے بچاؤ کا
خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانفِرُوا	سامان کر رکھو، پھر نکلو گروہ در گروہ یا نکلو
ثُبَاتٍ أَوِ انفِرُوا جَمِيعًا (النساء: ۷۱)	سب کے سب۔
وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا	اور تیار کر رکھو جتنا تم کر سکتے ہو طاقت میں
اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن	سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں میں سے جن
رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ	سے تم ڈراؤ گے اللہ کے دشمن کو اور اپنے
بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ	دشمن کو اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں
آخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ	کو جنھیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ جانتا ہے
اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ۔ (الانفال: ۶۰)	ان کو۔

اس لحاظ سے ہر وہ ساز و سامان اور ہر وہ تدبیر مسلمانوں کے لئے ضروری ہے جو ہماری جنگی قوت و مہارت میں اضافہ کرے۔ جنگی تربیت، تیر، لاٹھی، تلوار اور آتشیں اسلحہ جات کا استعمال، جنگی گاڑیوں، ٹینکوں، ہوائی اور بحری جہازوں کو چلانا سب اسی ضمن میں آتا ہے۔ کشتی، تیراکی اور شہسواری وغیرہ بھی اسی کے تحت آتی ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلحہ سازی

اُور سامانِ حرب کی صناعت کا کام بھی مسلمان خود سرانجام دیں۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے:

الا ان قوۃ الرمی الا ان القوۃ الرمی المسلم القوی خیر واحب الی اللہ من المسلم الضعیف۔ ان اللہ یدخل بالسھم الواحد ثلاثۃ فی الجنۃ، صانعہ یحتسب فی صنعہ الخیر، الرامی بہ، و منبلہ۔

جان لو کہ "قوّت" (جس کے پیدا کرنے کا قرآن میں حکم ہے) تیراندازی اُور نشانہ بازی ہے۔ طاقتور مسلم اللہ کے نزدیک زیادہ اچھا اُور پسندیدہ ہے بہ نسبت کمزور مسلم کے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ایک تیر کے طفیل تین کو جنّت میں، اُس کے بنانے والے کو (جو خیر کی نیت سے اُسے بنائے)، اس کے استعمال کرنے والے کو اور استعمال کے لئے دینے والے کو۔

ارموا وارکبوا و ان ترموا احب الیّ من ان ترکبوا من عَلّم الرمی ثم ترکہ فلیس منا۔

نشانہ بازی اُور شہسواری سیکھو اُور مجھے تمھاری نشانہ بازی سواری سے زیادہ پسند ہے۔ جس نے تیراندازی سیکھ کر اُسے ترک کر دیا وُہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ستُفتح علیکم ارضون و یکفیکم اللہ فلا یعجز

تم کئی ممالک کو فتح کروگے اُور اللہ تمھارے لئے کافی ہوگا۔ پس تیراندازی

احد کم ان یلھو بسھمہ   نہ چھوڑنا۔

عملاً بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ پیدل دوڑوں اور اونٹوں گھوڑوں کی دوڑوں میں شریک ہوئے، اپنے سامنے ان کے مقابلے کرائے اور ایسے مشاغل کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ایک مرتبہ تیر اندازی کے ایک مقابلے میں آپؐ ایک فریق میں شامل ہوئے تو دوسرے فریق نے عرض کیا "ہم اس گروہ پر کیسے تیر چلائیں جس میں آپ ہیں" آپ نے فرمایا:

ارموا و انا معکم کلکم   تم تیر چلاؤ میں تم سب کے ساتھ ہوں۔

آپؐ کے عمل سے کشتی اور تیر اندازی بھی ثابت ہے۔

اجرِ جہاد اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ کے عوض میں اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "اسلام کی چوٹی" قرار دیا ہے۔ اجرِ جہاد سے متعلق آیاتِ قرآنی میں سے چند آیات یہ ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَ	وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے
الَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا	ہجرت اور جہاد کیا ہے اللہ کی راہ میں یہی
فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ	لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی اُمید رکھتے
يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ۔	ہیں۔

(البقرۃ : ۲۱۸)

اَلَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا	وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے

جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ۔ (التوبة: ۲۰)

ہجرت اور جہاد کیا ہے اللہ کے رستے میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے بہت بڑھ کر ہیں درجے میں اللہ کے ہاں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔

لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (آل عمران: ۱۵۷)

اگر تم مارے گئے اللہ کی راہ میں یا مر گئے تو مغفرت اللہ کی طرف سے اور رحمت بہتر ہے اُس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (آل عمران ۱۶۹)

مت سمجھ تم اُن لوگوں کو جو قتل ہوئے اللہ کی راہ میں مُردہ، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَأُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ

پس وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی اور جو نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور

قَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ

مارے گئے، میں ضرور اُن کی بُرائیاں دُور کروں گا اور ضرور داخل کروں گا انھیں باغات میں، جاری ہیں جن کے نیچے نہریں، بطور اجر اللہ کی طرف سے اور اللہ کے ہاں ہے اچھا بدلہ۔

(آل عمران: ۱۹۵)

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ۔

اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں سے اُن کی جانوں اور مالوں کو اس کے عوض میں کہ ان کے لیے جنّت ہے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، پس مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

(التوبۃ: ۱۱۱)

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی مثال ہے جیسے ایک دانہ ہو جس سے سات خوشے اُگیں اور ہر خوشے میں سو دانے

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ.
(البقرة ۲۶۱)

ہوں اور اللہ دو چند کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الا اخبرکم بخیر الناس قالوا بلی یا رسول اللہ قال رجل یمسک برأس فرسہ فی سبیل اللہ حتی یموت او یقتل رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الف یوم فیما سواہ من المنازل۔

کیا تمھیں سب سے بہتر انسان کی خبر نہ دوں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا وہ انسان جو اپنے گھوڑے کو تھامے رہے یہاں تک کہ وہ مر نہ جائے یا مارا نہ جائے۔ اللہ کی راہ میں ایک دن کا پہرہ دوسری منازل کے ایک ہزار دن سے بہتر ہے۔

۱۹۳۶ء کا معاہدہ

مصر ۱۹۱۹ء سے اپنی آزادی کے لیے کوشاں ہے۔ سولہ سال تک انگریزوں سے بھیک مانگتے رہنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں انگریز از رہِ نوازش ایک معاہدہ کرنے پر آمادہ ہوئے جسے "معاہدۂ شرف و استقلال" کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سادہ لوحی اور دریوزہ گری کا بدترین مظاہرہ ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے درحقیقت ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہماری آزادی

کے پاسبان اور اجارہ دار انگریز ہیں۔ بعد کے تجربے نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ یہ معاہدہ ایک سراب اور اسم بے مسمّٰی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اِس معاہدے میں جو جو شرائط ہمارے حق میں کچھ بھی مفید ہو سکتی تھیں انگریزوں نے انھیں ایک ایک کر کے توڑا ہے۔ مثلاً اس میں ایک شرط یہ تھی کہ انگریز ہمارے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ اس شرط کی خلاف ورزی کی نمایاں مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں انگریزوں نے حکومتِ مصر سے الاخوان المسلمون کو خلافِ قانون قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ اگر ایک فریق کی کسی ملک سے جنگ ہو تو دوسرا اُس کی مدد کرے گا۔ ہم نے انھیں جنگ میں ہر طرح کی امداد دی مگر جب یہودیوں سے ہماری لڑائی کی نوبت آئی تو انگریزوں نے وعدہ کر لینے کے باوجود اسلحہ قیمتاً دینے سے بھی انکار کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں مصریوں کے اندر انگریزوں کے خلاف شدید جذبات مشتعل ہو چکے تھے اور مصر میں انگریزی اثر و نفوذ کا خاتمہ بالکل قریب نظر آرہا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصّہ "الاخوان" کا تھا۔ انگریزوں نے دوبارہ حکومتِ مصر کو ان کے خلاف اُبھارنا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ حکومت دشمن کے خلاف زور آزمائی کرتی، انھیں چھوڑ کر اس نے اپنے بھائیوں کو ظلم و ستم اور تعذیب کا نشانہ بنایا۔ انھیں جیلوں میں ٹھونسا گیا اور ان کی

جان، مال اور آبرو پر ایسے ایسے وحشیانہ حملے کیے گئے کہ انسان ان کا تصور کرتے ہوئے بھی لرز جاتا ہے۔

اعدائے اسلام سے موالات حرام ہے

ایک مسلمان کا عمل ہمیشہ خالص اسلام اور مسلمین کے مفاد کی خاطر ہونا چاہیے اور اس سے کفار کی خیر سگالی ہرگز مقصود نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ مسلمان کا دوست اور ہمدم مسلمان ہے اور کافر کا کافر۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک اُمت اور ایک قوم ہیں اور تمام دنیا کے کفار ملت واحدہ ہیں۔ قرآن میں ہے:

وَأَنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۔ (المومنون: ۵۲)	اور یہ کہ تمھاری یہ اُمت ایک ہی قوم ہے۔
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ۔ (الحجرات: ۱۰)	مومنین تو ایک برادری ہیں۔

اسلام نے غیر مسلموں سے دوستی اس لیے منع فرمائی ہے کہ اس سے مسلمانوں کی صفوں میں سخت انتشار اور فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔ اسلام اُن غیر مسلموں سے تو حسن سلوک اور ربط و ضبط کی اجازت دیتا ہے جنھوں نے مسلمانوں سے لڑائی یا اُن پر کوئی زیادتی نہ کی ہو لیکن جن کفار نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو اور ظلم و عدوان سے کام لیا ہو اُن سے مودت و محبت

اور میل جول رکھنے کی ممانعت ہے۔ قرآن میں یہ مضمون نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے:-

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً ۔ (آل عمران ۲۸)

مت بنائیں مومنین کافروں کو دوست مومنوں کو چھوڑ کر اور جو ایسا کرے گا، اُس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچ کر رہو۔

وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۔ (التوبۃ: ۷۱)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں اُن میں سے بعض بعض کے ولی ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۔ (الانفال)

اور وہ لوگ جو کافر ہوئے وہ ایک دوسرے کے اولیاء ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست، اُن کے بعض بعض کے دوست ہیں اور جو ان سے دوستی رکھے تم میں سے پس وہ انہی میں سے ہے

فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۔ (المائدہ: ۵۱)

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ ۔ (المائدہ: ۵۵)

تمھارا ساتھی تو اللہ اور اُس کا رسول ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ أَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔

(النساء: ۱۳۹)

جو لوگ بناتے ہیں کافروں کو رفیق مومنوں کو چھوڑ کر، کیا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے ہاں عزت۔ پس یقیناً عزت اللہ کے لیے ہے، ساری کی ساری۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۔ (الممتحنہ: ۱)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ساتھی۔ تم اظہار کرتے ہو ان کی طرف محبت کا حالانکہ اُنھوں نے کفر کیا ہے اُس کا جو آیا ہے تمھارے پاس حق میں سے۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ ہمراز اپنے سوا دوسروں کو۔

دُونِكُمْ۔ (آلِ عمران: ۱۱۸)

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ۔ (المجادلہ: ۲۲)	تم نہیں پاؤگے کسی گروہ کو جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر کہ وہ محبت کرتا ہو اُس سے جس نے مخالفت کی ہے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی خواہ وہ ان کے باپ ہوں، ان کے بیٹے ہوں، ان کے بھائی ہوں یا اُن کے خاندان والے ہوں۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ۔ (التوبہ: ۲۳)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو ساتھی اگر انھوں نے پسند کیا ہے کفر کو ایمان کے بدلے۔
تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ	تم دیکھتے ہو بہت سے ان میں سے محبت کرتے ہیں ان لوگوں سے جو کافر ہوئے اور بہت برا ہے جو آگے بھیجا ہے اُن کے لیے ان کی جانوں

اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ (المآئدۃ ۵: ۸۰، ۸۱)

نے، یہ کہ ناراض ہوا اللہ اُن پر اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور اگر ایمان لائے ہوتے اللہ پر، نبی پر اور اُس پر جو اُتارا گیا ہے اس کی طرف، نہ پکڑتے انھیں دوست اور لیکن اُن میں سے بہت سے فاسق ہیں۔

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ - إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ

نہیں منع کرتا تمھیں اللہ اُن لوگوں سے کہ نہیں لڑے وہ تم سے دین کے بارے میں اور نہیں نکالا اُنھوں نے تمھیں اپنے گھروں سے کہ تم اُن سے حسنِ سلوک کرو اور عدل کرو، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے: منع تو کرتا ہے اللہ تمھیں ان لوگوں سے جنھوں نے جنگ کی ہے تم سے دین کے معاملے میں تمھارے گھروں سے اور مدد کی ہے تمھارے اخراج پر، کہ تم اُن سے دوستی جوڑو اور جو انھیں رفیق بنائے وہی لوگ ظالم ہیں۔

يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ

اِن نصُوصِ صریحہ کے باوجود اور ان احکامِ قطعیہ کے علی الرغم ہمارے حکام اور زعما انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکنوں، روسیوں اور دُوسرے اعدائے اسلام سے دوستی کا دم بھرتے ہیں اور ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں سے لڑتے ہیں، بلادِ اسلامیہ پر بجبر مُستلط ہیں، اور اُن پر انواع و اقسام کے مظالم ڈھا رہے ہیں۔ ہمارے حکمران ان لوگوں کی خوشامد میں عزّ و جاہ کی تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں *

اسلام اور استعمار کی آویزش

اسلام کی راہ میں رکاوٹیں

گزشتہ مباحث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہماری اجتماعی زندگی تناقض، تصادم، انتشار اور فساد سے لبریز ہو چکی ہے اور گوناگوں مصائب و مشکلات نے ہمارے معاشرے کا گلا بُری طرح دبوچ لیا ہے۔ ہر مسلمان کو یہ بھی معلوم ہے کہ اُس کے جملہ امراض کا علاج اور سارے دُکھوں کا مداوا اسلام ہے۔ مسلمان صرف اس حقیقت کے اعتراف ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس بات کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں کہ ان کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسلام کے احکام و قوانین کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس علم و اعتراف اور اس مطالبے کے باوجود ہم اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہو رہے ہیں۔ اور کوئی شے ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے درمیان

برابر حائل ہو رہی ہے۔ اگر مسلمان بلادِ اسلامیہ کے اندر اقلیت میں ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ غیر مسلم اکثریت طالب اور مطلوب کے مابین حائل ہے لیکن امرِ واقعہ اس کے خلاف ہے مسلمان اپنے بیشتر ممالک میں غالب اکثریت کے مالک ہیں، ان میں سے بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کا سرکاری دین بھی اسلام ہے۔ پھر یہ ممالک جمہوریت کے بھی مدعی ہیں اور ان کے دساتیر میں اس مفہوم کی واضح دفعات بھی موجود ہیں، کہ یہاں حکومت اور قوانین کی تشکیل جمہور یعنی اہلِ ملک کی اکثریت کے حسبِ منشا عمل میں لائی جائے گی۔ پھر اسلام کی راہ میں آخر رکاوٹ کیا ہے؟ اگر آپ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس راہ میں بڑی رکاوٹیں صرف دو ہیں۔ ایک مغربی استعمار، دوسری مسلمانوں کی اپنی حکومتیں۔

استعمار

سامراج اور استعمار اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اسی استعمار نے سب سے پہلے اسلامی قوانین کی تنسیخ اور ان کی جگہ پر غیر اسلامی قوانین کی ترویج کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ اسلامی قوانین کے بل پر ایک مکمل اسلامی معاشرہ جہاں وجود میں آ جائے وہاں مغربی استعمار و استبداد اپنے قدم ہرگز نہیں جما سکتا۔ اسے لازماً راہِ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اسلام مسلمانوں میں صرف اللہ کے کلمے کو بلند دیکھنا چاہتا ہے اور استعمار کی آلائشوں کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام

مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیتا ہے کہ وہ کفر کے سامنے کسی لحاظ سے بھی جھکے یا اُس سے کسی حیثیت میں بھی دبے۔ اسلام نے مسلمان کو یہ سکھایا ہے کہ وہ استعمار کے خلاف ہر لحظہ سر بکف اور شمشیر بدست رہے اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جس وقت تک دینِ اسلام کو غلبہ نصیب نہ ہو جائے، اسلام کا بول بالا اور کفر کا بول پست نہ ہو جائے۔ اسلام نے امپیریلزم سے مودّت و موالات کو حرام کر دیا ہے اور اُس سے نفرت و کراہیت کو واجب قرار دیا ہے۔ اب آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ سامراج اسلامی فضا میں کیسے جڑ پکڑ سکتا اور پروان چڑھ سکتا ہے اور جس فضا میں سامراج قدم جمائے وہاں اسلام کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

اسلام رُوئے زمین کے تمام مسلمانوں کو ایک اُمت قرار دیتا ہے اور اُن سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دُشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوں۔ اعدائے اسلام مسلمان ممالک میں سے ایک ایک کو تو اپنے دامِ تزویر کا شکار بنا سکتے ہیں لیکن ساری دُنیا کی اسلامی وحدت کا مقابلہ بھلا وہ کیسے کر سکتے ہیں؟ اِس لیے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں اسلامی قوانین نافذ ہونے کے بجائے الگ الگ قومی اور غیر اسلامی قوانین نافذ ہوں اور ایک بین الاقوامی قومیت نشوونما پانے کے بجائے اُن میں الگ الگ مُلکی اور نسلی قومیتیں نشوونما

پائیں۔ جب تک دُنیا میں استعمار باقی ہے اسلام اور استعمار کی لڑائی بھی باقی ہے۔ اگر مسلمانوں میں قوت ہے تو وُہ برابر اس دشمن کے خلاف سینہ سپر رہیں گے، اگر ان میں قوت نہیں، تو وُہ برابر فراہمیِ قوت کے لیے جدوجُہد کرتے رہیں گے۔ وُہ استعمار سے ہنگامی معاہدات اور مصالحت کر سکتے ہیں لیکن جونہی وُہ مستعمرین کی طرف سے خیانت اور نقصان کا خدشہ محسُوس کریں گے، وُہ معاہدات کو اُن کے مُنہ پہ دے ماریں گے اور علانیہ اُن کے خلاف جنگ آزما ہو جائیں گے۔ اسلام میں احتکار، جبری استحصال ناجائز نفع اندوزی اور سُود کی ساری شکلیں حرام ہیں اور یہی وُہ اصل ستون ہیں جن کے سہارے استعمار کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگر یہ ستون ہٹا دیے جائیں تو سامراجی محل تناً فاناً فرشِ خاک ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ سامراج سیاسی یا اقتصادی حیثیت سے جب بھی مسلمان ممالک میں راہ پاتا ہے تو اُس کی اوّلین کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس ملک میں اسلامی احکام و قوانین کو معطل اور منسُوخ کیا جائے۔ ایک راستے سے اگر استعمار داخل ہونا شروع ہو تو دُوسرے رستے سے اسلام خارج ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

سامراجی ہتھکنڈے

سامراج اپنے مقصد کے حصول کے لیے اور اسلام اور مسلمانوں کے مابین حائل ہونے کے لیے عجیب و غریب اور طرح طرح کے حربے استعمال کرتا

ہے۔ وہ مسلمانوں کا ناصحِ مشفق بن کر انھیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اسلام کے قوانینِ پارینہ کو ترک کر کے مغرب کے قوانینِ جدیدہ کو اخذ کریں کیونکہ وہ قوت و ترقی اور تہذیب و شائستگی کے ضامن ہیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ ضعف و اضمحلال اور ہلاکت و فساد کا باعث ہیں۔ استعمار پسند مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور فراہمیِ قوت سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ اس لیے وہ اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ جذبہ بیدار اور یہ قوت پیدا نہ ہونے پائے۔ ہمیں برطانیہ کے وزیراعلیٰ گلیڈسٹون (Glad stone.) کے وہ الفاظ کبھی نہیں بھولنے چاہییں جو انھوں نے دارالعوام میں کھڑے ہو کر کہے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے "برٹش امپائر کے قدم اس وقت تک اسلامی ممالک میں نہیں جم سکتے جب تک اُن میں یہ کتاب موجود ہے جسے "قرآن" کہا جاتا ہے۔"

امپیریلسٹ طاقتیں اپنے واعظین اور مشنریوں سے بھی مدد لیتی ہیں چونکہ ان طاقتوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ علانیہ اور براہِ راست مسلمانوں کو کافر بنانا اور اسلام کے ترک و انحراف پر انھیں آمادہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے اب بالواسطہ تدریج کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے مقامِ رفیع سے زینہ بزینہ نیچے اُتارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مغرب کے مبلغین ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مذہب اور علم و عقل کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور دین نے ہمیشہ علم و

فن کے ارتقا کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مسیحی چرچ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جب تک ان دونوں کے دائرۂ کار کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر دیا گیا اقوامِ یورپ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکیں۔ وہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اُن کے زوال کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ دین سے غیر معمولی وابستگی رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر معاملے میں مذہب سے رہنمائی طلب کرتے ہیں۔ اُن کے بقول جب تک دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر دیا جائے گا اور یورپ والوں کی طرح جب تک لادینی حکومتوں کا قیام عمل میں نہیں آئے گا اُس وقت تک مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ مغربی مفکرین و واعظین کا یہ جادو بہت حد تک کام کر گیا ہے۔ ہمارے اپنے بہت سے مصنفین اور سیاسیین نے بھی اب یہی راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے ذہن کو مسموم کر دیا ہے اور استعمار پرستوں اور مشنریوں کے لیے زمین کو بہت حد تک ہموار کر دیا ہے۔ ہم میں سے بہت سے نام نہاد مسلمان ایسے ہیں جن کے ذہن، قلم اور زبان کو حقیر قیمت کے عوض خرید لیا گیا ہے۔ ان سے دین کی مخالفت کرائی جاتی ہے اور مسلمانوں میں اس بات کی تبلیغ کرائی جاتی ہے کہ وہ تمام دنیوی معاملات سے دین کو بے دخل کر دیں اور اہلِ مغرب کی طرح مذہب اور ریاست کے تعلق کو بالکل ختم کر دیں۔

اِس طریقے سے سامراجی طاقتیں اسلام اور مسلمین کے مابین حائل ہو کر اپنی گرفت کو مضبوط کرتی ہیں۔

اِسی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سرکاری مدارس میں دینی تعلیم کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ دُنیوی تعلیم میں نصاب سارے کا سارا مغرب سے مستعار لیا جاتا ہے۔ جو طلبہ ان مدارس سے سند لے کر نکلتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ حکومت و سیاست کے معاملات میں دین کو مداخلت کا اہل نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں دین کو دُنیوی معاملات سے کوئی علاقہ نہیں ہونا چاہیے اور اسے صرف خدا اور بندے کے تعلق سے بحث کرنی چاہیے۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ دین کے احکام سے نجات پائے بغیر کوئی قوم ترقی کے منازل اور تہذیب کے مدارج طے ہی نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اگرچہ دین کی ابجد سے بھی ناواقف ہوتے ہیں لیکن اس جہالت کے باوجُود وُہ دین کے بارے میں فیصلے صادر فرمانے کی جسارت کرتے ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کی حکومت اور اُن کی تعلیم و تربیت کی باگ ڈور آج کل ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی تعلیم و تربیت کی فضا میں سے خال خال ہی لوگ ایسی ابراہیمی فطرت کے نکل سکتے ہیں جو اپنے گردوپیش پر تنقید، محاسبہ اور موازنہ کی نگاہ ڈالیں اور اس حقیقت کو بھانپ لیں کہ استعمار اپنا کام کس مستعدی اور صفائی سے سرانجام دے رہا ہے اور کس

طرح ان لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنا رہا ہے۔

دین وسیاست کی علیحدگی

اگر مسلمان یہ سمجھ بیٹھیں کہ یورپ کی "ترقی" کا راز دین و سیاست کی جدائی میں مضمر ہے تو یہ ان کی سادہ لوحی اور بے خبری کی بہت بڑی دلیل ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس مسیحیت سے یورپ آشنا رہا ہے اس میں حکومت، سیاست اور دوسرے اجتماعی معاملات سے متعلق احکام وضوابط سرے سے تھے ہی نہیں کہ مذہب کو سیاست سے جوڑنے یا توڑنے کا سوال پیدا ہوتا۔ مسیحیت کو عروج اس وقت نصیب ہوا ہے جب رومن امپائر نے اس کی سرپرستی کو قبول کیا اور اسے سرکاری مذہب قرار دے کر اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس وقت اس سلطنت کا اپنا ایک مکمل قانون موجود تھا جسے آج تک "رومن لا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عیسائیت کے سرکاری مذہب قرار دیے جانے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اس سلطنت کا قانون یہی رومی قانون تھا۔ اور اس وقت جبکہ یورپ کی بیشتر ریاستیں اپنے آپ کو سیکولر ریاست کہلانا پسند کرتی ہیں، ان کے قوانین کی اساس اسی رومی قانون ہی پر رکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسیحیت میں نہ تو ریاست کی رہنمائی کے لیے کوئی قانونی ضابطہ کا سرمایہ موجود تھا اور نہ ہی اسے ریاست

کے قوانین میں مداخلت کا کوئی خاص موقع مل سکا۔ البتہ عیسائیت کے سرکاری مذہب ہو جانے کا اتنا نتیجہ ضرور نکلا کہ اس کی بعض اخلاقی ہدایات کا اثر قانون سازی پر مترتب ہوا۔ لیکن اس کے بعد ایک افسوسناک صورتِ حال رونما ہوئی اور وہ یہ کہ اربابِ کلیسا نے اربابِ حکومت سے ایک ناپاک سازش اور خفیہ گٹھ جوڑ کر لی اور خدایانِ کلیسا تختِ سلطنت پر متمکن ہو گئے۔ شریعت کے احکام تو اُن کے ہاں تھے ہی نہیں۔ انھوں نے اپنی عقل کے بل پر، بلکہ اٹکل پچّو اور نفسانیت کی بنا پر کچھ اصول وضوابط گھڑ لیے اور انھیں مذہب اور خدا کے نام پر لوگوں کے سر منڈھنا شروع کر دیا تاکہ عوام کو اپنی خواہشات کا غلام بنا کر رکھیں۔ کچھ عرصے تک یہ صورتِ حال قائم رہی لیکن بعد میں سیاست اور فکر ونظر کے میدان میں ان مذہبی اجارہ داروں کے رقیب پیدا ہو گئے۔ غلبہ و اقتدار کے حصول کی خاطر ان دونوں گروہوں میں شدید اور خونریز کشمکش برپا رہی جس میں آخر کار خدایانِ کلیسا کو شکستِ فاش نصیب ہوئی اور ان کے مخالفین سیاست وسیادت کے مقام پر فائز ہو گئے۔

درحقیقت یہ لڑائی دین و الحاد کی لڑائی نہیں تھی اور نہ ہی بنائے نزاع یہ اصول تھا کہ ریاست و سیاست کا دین سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ حقیقت میں یہ ایک جنگِ اقتدار تھی جو خالص ہوائے نفس کی بنیاد پر لڑی جا رہی

تھی۔ دین و مذہب سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ایک طرف کلیسا کے ٹھیکیدار تھے جو مذہب کے نام پر فریب کاری کر رہے تھے، دُوسری طرف عام سیاست باز تھے جو قوم کے "عوام اور جمہور" کے نام پر اپنا سکہ چلانا چاہتے تھے۔ یہ اُصولوں کی جنگ نہیں تھی بلکہ افراد اور ذاتیات کی جنگ تھی جو پردے لیے اُصولے پن کے ساتھ لڑی جا رہی تھی۔ ریاست اور اُس کے قانون کی دین سے جتنی کچھ وابستگی یا علیحدگی پہلے تھی وہ کم و بیش اب بھی موجود ہے۔ اگر آپ گزشتہ چند صدیوں کے یورپین قوانین کا مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ ان میں کوئی بنیادی اور اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ سوائے اس کے کہ پہلے حاکمیت چرچ کے نام پر درج تھی اور اب "جمہور" کے نام درج ہے۔ ورنہ حال وہی ہے کہ پہلے بھی چند انسان اپنے ظن و تخمین کی بنا پر قانون سازی کرتے تھے اور اب بھی چند انسان اپنے گمان و قیاس کے بل پر قانون بنا رہے ہیں۔ قانون کی بنیاد بھی وُہی ردّی لائی ہے۔ اس میں صرف اِتنی تبدیلی ہوئی ہے جتنی مختلف حالات و ادوار میں ناگزیر سمجھی گئی ہے۔

تاریخی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کلیسا اور اُس کے مخالفین کے مابین جو کشمکش برپا ہوئی ہے اُس سے دو نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک خاص گروہ کے سیاسی اقتدار کو مذہب کی حمایت حاصل نہیں رہی اور اس کا امکان باقی نہیں رہا کہ ایک خاص طبقہ مذہب کے نام سے ہمیشہ حکومت

پر قابض یا غالب رہے۔ دُوسرے یہ کہ اب خیال و عقیدہ کی آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ اہلِ کلیسا لوگوں سے ایک خاص عقیدہ بجبر منواتے تھے اور جو نہیں مانتا تھا اُسے انواع و اقسام کی اذیتوں میں مبتلا کرتے تھے۔ یہ دونوں نتائج اپنی جگہ پر بہت مفید ہیں اور ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے حصول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اب دین اور سیاست میں کوئی رشتہ باقی نہیں ہے یا اس رشتے کو اب ختم کیا جانا چاہیئے۔ دین پر قانون کی بنا رکھنے کا بھی ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ سیاست و حکومت پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری قائم کی جائے یا لوگوں کو کسی عقیدے کا زبردستی پیرو بنایا جائے۔ کم از کم اسلام میں ایسی صورت پیدا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں علما و فقہا کا کوئی نسلی یا پیشہ ور گروہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان عالم اور فقیہ بن سکتا ہے اور اسلام کا اُس سے مطالبہ بھی یہی ہے کہ وہ عالم اور فقیہ بنے اور جاہل نہ بنے۔ اسلام کے قوانین و احکام کے لحاظ سے بھی علما و فقہا کو کوئی ایسے پیدائشی حقوق نہیں دیئے گئے ہیں جن سے دُوسرے مسلمانوں کو محروم کر دیا گیا ہو۔ اسی طرح اسلام میں عقیدہ و خیال کی بھی پوری آزادی ہے اور لوگوں سے زبردستی کوئی عقیدہ تسلیم کرانا قطعاً ممنوع ہے۔ قرآن میں صاف آیا ہے "لَآ إِكْرَاهَ فِى الدِّينِ" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ "أمرنا بترکھم وما یدینون"

(ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے دین پر چلنے کے لئے چھوڑ دیں)۔

بلادِ اسلامیہ اور بلادِ یورپ

مسلمان ممالک کا حال یورپین ممالک سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارا دین مسیحیت کی مانند نہیں ہے۔ ہمارے دین میں جس طرح زندگی کے ہر معاملے سے متعلق واضح اور قطعی احکام موجود ہیں، اسی طرح سیاست وحکومت کے بارے میں بھی بالکل صاف اور صریح احکام موجود ہیں۔ اس وجہ سے اس امر کا ہرگز خدشہ نہیں ہے کہ اگر قوانین کی بنا دین پر ہو تو حکمران یا علما من گھڑت قوانین کو خدا اور مذہب کے نام پر پیش کر دیں گے۔ اسلامی قوانین پر مبنی حکومتوں کی کارفرمائی ہمارے ہاں صدیوں تک رہی ہے، ان میں اسلامی اصولوں سے انحراف بھی ہوا ہے مگر انحراف کو ہمیشہ انحراف سمجھا گیا ہے، اسے مذہبی تقدیس کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام میں سیاست وحکومت سے متعلق احکام وہدایات اسلامی تعلیمات کا ایک اہم اور لاینفک جزو ہیں۔ اگر انہیں ترک کر کے ان کی جگہ پر غیر اسلامی قوانین کو رائج کیا جائے تو یہ دین سے صریح خروج اور بغاوت کے مترادف ہے۔ عیسائیوں نے جب مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا اعلان کیا تھا، عملاً انہیں اپنے قوانین میں تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ عیسائیت کا دامن قانون وشریعت سے پہلے ہی تہی تھا اور

رُومی قوانین کو پہلے ہی بالادستی حاصل تھی۔ بہرحال نہ ہی اس معاملے میں اسلام کو مسیحیت پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس معاملے میں مسلمانوں کی تاریخ اور یورپ کی تاریخ میں کسی طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

دین موجبِ زوال نہیں ہے

استعمار پرست اور ان کے شاگردانِ رشید گئے ممالک میں یہ تبلیغ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا باعث اِتباعِ دین ہے لیکن اکثر مغربی ممالک خود اب تک مذہب کے پابند ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی حکومتیں اور ان کے عوام کروڑوں پاؤنڈ عیسائیت کی تبلیغ پر خرچ کرتے ہیں۔ اگر مذہب کی پابندی موجبِ زوال ہے تو یہ ممالک اپنے مذہب کو خیرباد کیوں نہیں کہتے اور دوسروں میں اس کی تبلیغ سے کیوں باز نہیں آتے۔ کسی اور مذہب کی پیروی زوال کا باعث ہو یا نہ ہو، اسلام کی پیروی تو انسان کو عروج و ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے والی ہے۔

اسلام نے مسلمان پر واجب ٹھہرایا ہے کہ وہ قوت عزت، تفوق اور قیادت کے اسباب و وسائل فراہم کرے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ مسلمان خیر کا داعی بنے اور بھلائی کے سارے کاموں میں دوسروں سے تعاون کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ساری انسانی برادری کو مساوات و اخوت اور عدل کی بنیادوں پر منظم کرے اور اسے خوف، جہل، ضعف

اور فقر سے نجات دلائے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا سے ظلم، جبر و استبداد، استکبار اور ناجائز استحصال و انتفاع کو مٹائے۔ اللہ نے جس شکل میں اسلام کو نازل فرمایا ہے اگر اسے اسی کامل و جامع شکل میں نافذ کر دیا جائے تو نوعِ بشری کے جملہ مصائب و آلام کا خاتمہ ہو جائے اور دنیا کی ہر مشکل آسان ہو جائے۔

اسلام اور استعمار کی آویزش

اسلام اور استعمار اپنی فطرت و طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ چنانچہ حال یہ ہے کہ اسلام سے استعمار اس حد تک خائف و پراساں رہتا ہے کہ اسلام کی آمد کے تصور سے دل کا چین اور راتوں کی نیند استعمار کے حق میں حرام ہو جاتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا انبوہ کثیر دیکھ کر سامراج کے ماتھے پر بل تک نہیں آتا لیکن ایک مٹھی بھر اسلامی جماعت کا وجود اسے انگاروں پر لوٹا دیتا ہے۔ سامراج جانتا ہے کہ عام سیاسی جماعتیں مادی اور دنیوی مقاصد کی طالب ہیں اس لئے انہیں راضی اور مطمئن کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن حقیقی مسلمان رضائے الٰہی اور شہادت فی سبیل اللہ کا طالب و متلاشی ہے۔ ایسے مسلمان کو اپنے مطلوب کی تلاش سے غافل کرنا اور کسی کمتر متاعِ دنیا پر اسے قانع اور مطمئن کر لینا آسان نہیں ہے۔ مسلمان ممالک میں جب جہاد، قتال اور شہادت کا جذبہ

بیدار ہوتا ہے تو مغربی طاقتیں مسلمان حکمرانوں سے ساز باز کرتی ہیں اور ان سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اسلام کے داعیوں پر تشدد کریں اور انہیں اللہ کی راہ میں پیشقدمی کرنے سے روکیں۔ لیکن سچے مسلمان دبنے اور ہتھیار ڈالنے سے انکار اور ابا کرتے ہیں اور یگانوں اور بیگانوں کی دو مکھی لڑائی کے مقابلے میں اللہ سے صبر و ثبات اور استقامت کی دعا مانگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام غافل مسلمانوں کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں۔ وہ برائی العین اس کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کا اصل دشمن کون ہے اور اُن کی دلی ہمدردیاں اور ان کا عملی تعاون آخرکار انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کا لڑنا مرنا خالص اسلام کے لئے ہے۔

آخری معرکہ اسلام اور سامراج کی کشمکش اب ایک نئے اور انتہائی نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے پرانے سامراج کے پہلو میں اب نیا سامراج جنم لے چکا ہے بلکہ پروان چڑھ چکا ہے۔ یہ روسی سامراج ہے جس کی بھیانک اور مہیب پرچھائیں اسلامی ممالک پر پڑ رہی ہے۔ پرانے سامراج کو اس امر کا بخوبی علم ہے کہ اس یاجوج ماجوج کے بالمقابل اگر کوئی شے سدِ سکندری کا کام دے سکتی ہے تو وہ فقط اسلام ہے۔ استعمارِ قدیم اب دو بلاؤں کے درمیان گھر گیا ہے۔ اگر وہ روس کے لئے میدان کھلا چھوڑ دیتا ہے تو اسے یقین

ہے کہ اشتراکیت کا دیو ہر چیز کو چٹ کر جائے گا اور پرانے سامراج اور اس کے متعلقات اور باقیاتِ سیئات کا بھی قطعی صفایا ہو جائے گا۔ اگر استعمارِ قدیم اسلام کی آمد کو نہیں روکتا، تب بھی اسلام اس استعمارِ قدیم کے آثار کو بلادِ اسلام میں سے محو کر دے گا۔ پرانے سامراج کی اب کوشش یہ ہے کہ وہ کرائے کا سپاہی بنا کر مسلمانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرے اور روسی الحاد کے مقابلے میں خدا پرستی کی دہائی دے کر مسلمانوں کو اپنے حق میں اور روس کے خلاف استعمال کرے لیکن یہ ایک خوابِ پریشاں ہے جو اللہ نے چاہا تو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اسلام استعمارِ جدید اور استعمارِ قدیم دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھتا ہے اور دونوں کو انتہائی نفرت، غضب اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اسلام سے بغض رکھتے ہیں اور محض مسلمان ممالک پر تسلط حاصل کرنے کے لئے اور وہاں سے ایک دوسرے کو بے دخل کرنے کے لئے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ آخر مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دشمن کی حمایت میں دوسرے دشمن کے خلاف لڑیں، البتہ اسلام کا اور مسلمان کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ یا تو غیر جانبدار کی حیثیت سے انتظار کرے یا اگر لڑے تو محض اپنی حمایت و محافظت میں لڑے۔ اینگلو امریکی اور روسی بلاک کی اس آویزش کے ذریعے سے درحقیقت

اللہ نے مسلمانوں کے لیئے دونوں دشمنوں سے نجات پانے کا ایک موقع فراہم کیا ہے۔ یہ در اصل دو چوروں کی لڑائی ہے جو ہمارے گھر میں نقب زنی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ہاں چوری اور نقب زنی کی راہ ہموار کریں تو ہم ایک چور کے مقابلے میں دوسرے چور کی امداد کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم اپنا گھر بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں چوکنّا ہو کر اس لڑائی کے انجام کا منتظر رہنا چاہیئے اور جو فریق بھی ہماری طرف بڑھے اُس سے لڑنا چاہیئے۔ ایک سچے مسلمان کو کبھی بھی امپیریلسٹوں کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیئے اور جب تک وہ مسلمان ممالک میں اپنے ظلم وستم اور اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہ آئیں، اُس وقت تک اُن پر قطعاً اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلام اور استعمار اس وقت میدانِ کارزار میں ہیں۔ آخری معرکے کا وقت آن پہنچا ہے۔ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو یوم موعود کے لیئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ انشاءاللہ مومنین اللہ کی نصرت و تائید سے سرفراز ہوں گے۔ سرمایہ داروں اور بالشویکوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ انجام کس کے حق میں ہے۔

مسلمان حکومتوں کا رویہ ہم اس سے پہلے وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ مسلمان ممالک کی حکومتیں کس طرح اسلام کے خلاف جنگ آزما ہیں اور کس طرح وہ اسلام کی راہ

میں جہاد کرنے والوں کو نشانۂ ستم بنا رہی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ حکومتیں کس طرح سے اللہ کے حرام کو حلال اور اللہ کے حلال کو حرام قرار دے رہی ہیں، اسلامی قوانین کو معطل کر رہی ہیں اور حدود اللہ کو پامال کر رہی ہیں۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ان حکومتوں کی مساعی سامراجیوں کی حمایت اور جمہور مسلمین کی مخالفت کے لئے وقف ہیں۔ ہم اس سلسلے میں بے شمار مثالیں پیش کر چکے ہیں جن سے ان حکومتوں کے دعواے اسلام کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان کی ساری دوڑ دھوپ اسلام کے مفاد کے منافی ہے یہاں ان مباحث و امثال کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن مناسب ہوگا کہ یہاں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان حکومتوں کی اس روش کا باعث کیا ہے۔ اس روش کے دو بڑے وجوہ ہیں۔ ایک احکام اسلام سے ناواقفیت، دوسرے اقتدار کے چھن جانے کا خوف۔ یہ امر انتہائی افسوسناک اور اذیت بخش ہے کہ مسلمان ممالک کی عنانِ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام سے قطعی جاہل ہیں وہی ہماری قوم کی گاڑی کے چلانے والے ہیں اور وہی بین الاقوامی مجالس و تقریبات میں اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی اور ترجمانی کرنے والے ہیں۔ ان میں سے بہت سے حکمران ایسے بھی ہیں جن کے آباء و

اجداد گہرے اور پختہ اسلامی علم و عمل سے آراستہ تھے اور یہ لوگ آج بھی اپنی انفرادی زندگی میں متدیّن ہیں لیکن ان کا اسلام چند مراسم عبادات تک محدود ہے اور وہ ایک عامی مسلمان سے زائد کچھ بھی اسلام کا علم نہیں رکھتے۔ اُن کے ذہن میں اسلام صرف صوم و صلوٰۃ اور حج کا نام ہے۔ وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ اسلام دنیا و آخرت کے ہر مسئلے پر حاوی ہے اور وہ مسجد سے لے کر ایوانِ حکومت تک ہماری ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔ انھیں معلوم نہیں ہے کہ اصولِ اسلام میں سے اوّلین اصول یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی نازل کردہ ساری تعلیمات پر ایمان لائے اور ایمان فقط قول و اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ عمل بھی اس کا لازمی تقاضا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

لیس الایمان بالتمنی	ایمان کا انحصار تمناؤں پر نہیں ہے بلکہ
ولکن ما وقر فی	ایمان وُہ ہے جو دل میں جاگزیں ہو اور
القلب وصدقه العمل	عمل اس کی تصدیق کرے۔ کچھ لوگ دُنیا
وان قوما خرجوا من الدنیا	سے اس حال میں اُٹھے کہ اُن کے لئے کوئی
ولا حسنة لهم وقالوا	بھلائی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اللہ سے
نحسن الظن بالله وکذبوا	نیک گمان رکھتے ہیں حالانکہ وُہ جھوٹے
لو احسنوا الظن	ہیں۔ اگر انھوں نے اچھا گمان رکھا ہوتا تو

لا حسنوا العمل۔ اعمال بھی اچھے کرتے۔

ہر شخص سے عمل کے بارے میں سوال ہوگا۔ اگر اُس نے اچھا عمل کیا ہے تو اُس کے حق میں مفید ہوگا اور اگر بُرا کیا ہے تو اس کے حق میں مُضر ہوگا۔

قرآن میں ارشاد ہے :۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ (التوبۃ : ۱۰۵)	کہہ دو کہ عمل کرو۔ پس عنقریب اللہ دیکھے گا تمہارے عمل کو اور اس کا رسولؐ بھی۔
فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الحجر : ۹۳)	پس تیرے رب کی قسم ہم پوچھیں گے ان سب سے ان کے عمل کے بارے میں۔
وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ أُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الزخرف : ۷۲)	اور یہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، اُس کے بدلے جو تم کرتے تھے۔

حکمرانوں کی جہالت

ہمارے حکمرانوں کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ نے ہم پر اسلام کے قوانین کی پابندی فرض کی ہے اور ہمیں اس کی اجازت نہیں دی کہ ہم کسی اور قانون کی پیروی کریں۔ انھیں معلوم نہیں کہ ہماری حکومت کی اساس منزل من اللہ احکام پر قائم

ہونی چاہئے اور جو اللہ کی نازل کردہ تعلیم کے مطابق حکومت نہ کرے وہ فسق و کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اطاعت اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کرے۔ اللہ کے احکام میں تفریق نہیں کی جا سکتی اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے حکم کو پیروی کے لئے منتخب کرنے کی اجازت ہمیں نہیں دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ	کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصے پر اور کفر کرتے ہو کچھ حصے کا۔ پس کچھ نہیں جزا اس کی جو ایسا کرے تم میں سے سوائے دنیا کی زندگی کی ذلت کے اور قیامت کے دن وہ زیادہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

(البقرۃ : ۸۵)

وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ	اور بچ ان سے مبادا وہ فتنے میں ڈال کر تجھے ہٹا لیں اللہ کی نازل کردہ تعلیم کے کچھ حصے سے۔

(المائدۃ : ۴۹)

ان حکمرانوں کو اس امر کا مطلق احساس نہیں ہے کہ اقامتِ دین

حکومت کا اوّلین فریضہ ہے اور دین میں عبادت، سیاست، معیشت اور اخلاق سب کچھ شامل ہے۔ اسلام کی دعوت کا قیام، اس کی اشاعت اور حدود اللہ کو قائم رکھنا حکومت کے واجبات میں سے ہے۔ انھیں معلوم نہیں ہے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو اپنے ہاں نافذ کرکے شرعوا لھم من الدین ما لم یاذن بہ اللہ کے مصداق بن رہے ہیں، یعنی وہ ایک ایسا دین گھڑ رہے ہیں جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ وہ لوگوں کو تحاکم الی الطاغوت پر مجبور کر رہے ہیں اور اس طرح شیطان انھیں دور کی گمراہی میں مبتلا کر رہا ہے۔ ان کا حال اُن لوگوں کا سا ہے جن کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ۔ (النور : ۴۸)	اور جب انھیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے اُن کے درمیان اُس وقت ان کا ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے۔
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ	اور جب کہا جاتا ہے اُن سے آؤ اللہ کی نازل کردہ چیز کی طرف اور رسولؐ کی طرف تو دیکھتا ہے منافقین کو کنی کتراتے ہوئے۔ پس کیا حال ہوتا ہے جب انھیں مصیبت پہنچتی ہے۔ اپنے

صُدُودًا۔ فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا۔ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِىٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا۔ (النساء: ۶۱، ۶۲)

کتراؤں کی وجہ سے پھر آتے ہیں تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہم تو صرف صلح صفائی چاہتے تھے۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ جانتا ہے پس ان سے اعراض کر اور انھیں نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دل میں اُترنے والی ہو۔

ان حکمرانوں کو معلوم ہے کہ یہ قوانینِ جدیدہ انسانی خواہشات ہیں اور حکمرانوں کی تراوشِ افکار ہیں لیکن کیا اُنھیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ نے ایسی خواہشات وافکار کی پیروی کرنے اور کرانے سے منع فرمایا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان قوانین نے اہلِ مغرب کو بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے؛ حالانکہ اس گمان میں ذرہ برابر حقیقت نہیں ہے۔ کیا جس وقت مسلمانوں نے یورپ والوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا تھا اور جس وقت صلیبیوں کو مار مار کر نکال دیا تھا اور جس وقت یورپ کے اطراف میں

مسلمانوں کا سکہ رواں تھا، کیا اُس وقت یورپ میں یہی قوانین رائج نہیں تھے؟ اگر دُنیا کی بھیڑ مسلمان سے اختلاف رکھتی ہے یا اُس کی مخالف ہو تو مسلمان کو اس کی کیا پروا ہے۔ حق اتباعِ کثرت و اکثریت کا نام نہیں ہے۔ حق، صرف خدا و رسولؐ کے پیچھے چلنے کا نام ہے:۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا (یونس: ۳۶)
ان کی اکثریت نہیں پیروی کرتی مگر ظن کی۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔ (الانعام: ۱۱۶)
اور اگر تو پیروی کرے اہلِ زمین کی اکثریت کی تو وہ تجھے بھٹکا دیں گے اللہ کی راہ سے۔

مومن تو امرِ الٰہی کا پابند ہے۔ وہ سرِ مُو اس راستے سے انحراف نہیں کر سکتا۔ وہ بارگاہِ ہوا وہوس کا بندہ نہیں ہے۔ اُسے لوگوں سے نہیں بلکہ اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمارے حکّام کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ مسلمان اللہ کی نافرمانی کر کے ان کی فرمانبرداری کریں گے۔ کفر و طاغوت کی طاعت تو اُن پر حرام کی گئی ہے اور اللہ و رسولؐ کی پکار پر لبیک کہنا اُن پر واجب کیا گیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا
اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو لبیک کہو اللہ اور رسولؐ کو جب وہ تمہیں

دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

(الانفعال: ٢٤)

بلائیں اُس شے کی طرف جو تمھیں زندگی بخشتی ہے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا.

(النور: ٥١)

مومنین کا قول تو یہ ہے کہ جب انھیں بُلایا جائے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف کہ وُہ ان کے مابین فیصلہ کریں تو وُہ کہتے ہیں "سنا ہم نے اور مانا ہم نے"۔

یہ ہیں ہمارے فرمانروا! اور یہ ہیں اُحکامِ اسلام! اگر وُہ ان احکام سے جاہل ہیں تو اس جہالت کا نتیجہ مسلمانوں کی اور خود اُن کی تباہی اور ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور اگر وُہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں یا ان احکام کا صریح انکار کرتے ہیں تو اُنھوں نے اللہ کے عہد کو توڑ دیا ہے۔ انھوں نے اس شے کو توڑا ہے جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا تھا۔ اُنھوں نے اللہ کی زمین میں فساد کا بیج بو دیا ہے انھوں نے خدا کا بندہ ہونے اور اس کی عبادت و عبودیت بجا لانے سے انکار کر دیا ہے۔ انھوں نے تختِ حکومت پر بیٹھ کر اپنی خدائی اور کبریائی کا ڈنکا بجانے کی کوشش کی ہے۔ میں ان لوگوں کو خدا کا

یہ پیغام سنائے بغیر نہیں رہ سکتا :۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ أَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ أُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ۔	اور جو لوگ توڑتے ہیں اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد اور کاٹتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اللہ نے اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے لعنت ہے اور برا ٹھکانا ہے۔

(الرعد : ۲۵)

وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا وَ أَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا	اور جو اس کی بندگی کو عار سمجھے اور بڑا بن بیٹھے۔ پس ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔۔۔ اور جو لوگ بندگی کو عار سمجھتے تھے اور بڑے بنتے تھے پس انھیں دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ پائیں گے۔

نَصِيْرًا۔ (النساء: ۷۲)

حرصِ اقتدار

یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان ممالک کے اربابِ حکومت پر اقتدار کی حرص اور اس کے چھن جانے کا خوف بُری طرح سے مسلط ہے۔ وہ اس اقتدار کا دائمی پٹہ اپنے نام لکھوانے کے لئے فکر مند رہتے ہیں اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ اپنی عزت، اپنے وطن اور اپنے ابنائے وطن کی عزت کو اقتدار کی بھینٹ چڑھانے میں تامّل نہیں کرتے۔ وہ اللہ اور اللہ کے دین کے دشمنوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے دین کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ وہ پورے اخلاص، آمادگیٔ نفس اور طمانیتِ قلب کے ساتھ اعدائے اسلام سے دوستی گانٹھتے ہیں۔ وہ یہ سارے پاپڑ محض اس لئے بیلتے ہیں کہ اقتدار کی کرسی اُن کے نیچے سے کھسکنے نہ پائے اور نہ اُن کی فرمانروائی کا سنگھاسن ڈولنے پائے۔ وہ انگریزوں، روسیوں، فرانسیسیوں اور امریکنوں کی اطاعت بجا لاتے ہیں اور بے گناہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی جان، مال اور آبرو سے کھیلتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا فرمان ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اگر
إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا	تم اطاعت کرو گے ان لوگوں کی جنھوں

يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ۔

نے کفر کیا وہ پھیر دیں گے تمھیں اُلٹے پاؤں، پس ہو جاؤ گے تم گھاٹا پانے والے بلکہ اللہ تمھارا ساتھی ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

(آل عمران: ۱۴۹)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ۔ (آل عمران: ۱۰۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا جو اہلِ کتاب میں سے ہے تو وہ بنا دیں گے تمھیں تمھارے ایمان کے بعد کافر۔

کیا ان حکمرانوں کو معلوم نہیں ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب آج بھی مسلمانوں کی ہواخواہی کا دم محض اس لئے بھرتے ہیں تاکہ انھیں کفر کی طرف لوٹا دیں۔ یہ حکمران ان لوگوں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی ہرگز نہیں کرتے جو اسلام کے خادم ہیں۔ کیونکہ یہ حکمران مسلمان ریاستوں کو اللہ کے رنگ میں نہیں بلکہ غیر اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ وہ اس تہمت سے بچنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں ان کے بارے میں کوئی یہ نہ کہدے کہ یہ اسلام کے حق میں متعصب ہیں اور کٹر

مسلمان ہیں۔ بس اس ڈر کے مارے وہ اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں حالانکہ اسلام ہی اُن کے لئے اور ان کی قوم کے لئے طاقت و عزت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اگر وہ اسلام کی حقیقت پر غور کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ اسلام سے محبت اور کفر سے بغض ہی تو ایک مسلمان کا طُرۂ امتیاز ہے۔ مسلمان پر تو لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے گردوپیش کو اللہ کے رنگ میں رنگ دے۔ صبغة الله ومن احسن من الله صبغة۔

افسوس کہ اسی ہوسِ اقتدار نے اقتدار کے بھوکوں کو ذلیل و رسوا کر رکھا ہے اور اسلام سے جہالت نے اسلام کا راستہ روک رکھا ہے۔ تمام دُنیا کے مسلمانوں کو ایسے اربابِ حکومت سے پالا پڑ گیا ہے جن کا نصب العین احکامِ اسلام کا قیام نفوذ نہیں بلکہ اپنے اقتدار کا بقاء و قیام ہے۔

أَيُّهَا الْمُسْلِمُوْنَ!

اے مسلمانو! تمام بلادِ اسلامیہ استعمار پسندوں کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ استعمار یہاں کی زمین و آسمان پر چھا گیا ہے۔ اس نے ہمارے ہاں تسلّط جما رکھا ہے۔ ہماری بوٹیاں نوچی جا رہی ہیں ہمارا خون نچوڑا جا رہا ہے۔ ہمارے معتقدات کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔ ہماری حرمت و ناموس

سے کھیلا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنے دین سے برگشتہ کیا جا رہا ہے۔

اے مسلمانو! تمھارے ہاں ایسے قوانین رائج ہیں جنھیں تمھارے دین اور تمھاری تہذیب سے کوئی نسبت اور کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تمھارے شعور وعقیدہ کی کھلی توہین ہے۔ اس سے تمھارے درمیان فتنہ و فساد کی اشاعت ہو رہی ہے۔ یہ استعماری حربے ہیں جو تمھارے خلاف استعمال کئے جا رہے ہیں۔ انھوں نے لوٹ کھسوٹ کو قانونی شکل عطا کی ہے اور کافرانہ حکومت کے لئے سند جواز مہیا کی ہے۔

اے مسلمانو! یہ تمھاری حکومتیں ہیں جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر رہی ہیں، قوانین اسلام کو معطل کر رہی ہیں، اسلام کے خادموں پر مظالم ڈھا رہی ہیں اور مغربی طاقتوں سے ساز باز کر رہی ہیں۔

اے مسلمانو! یہ تمھاری زندگی کا اجتماعی نظام ہے جس پر تمھارے قلوب مطمئن نہیں ہیں اور تمھاری طبائع راضی نہیں ہیں لیکن اس نظام کو تمھارے اوپر تمھاری حکومتیں استعماری طاقتوں کی مدد سے بجبر مسلط کر رہی ہیں۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس فاسد نظام کو منہدم کر دیا جائے اور اس کی جگہ اسلامی نظام برپا کیا جائے۔ جب تک سامراجیوں اور ہماری حکومتوں کی پیدا کردہ رکاوٹیں تمھاری راہ سے دور نہیں ہوں گی، اسلام کی آمد اور پیش قدمی ہمیشہ موخر ہوتی رہے گی۔ آیئے ہم اپنی جانوں اور اپنے مالوں

کو اس مقصد کی خاطر قربان کریں اور اپنے مخالفین کا مقابلہ صف بستہ ہو کر کریں۔ ہمیں آخری اور فیصلہ کن معرکے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ فیصلے کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔

ولینصرن اللہ من ینصرہ . . . واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

دُوسرا حصّہ

مطالبۂ نفاذِ شریعت

(الامام حسن البنّاء مرحوم)

[یہ مضمون دراصل ایک طویل مکتوب کا ترجمہ ہے جو اُستاد حسن البنّا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے تقریباً ستر و سال قبل مصر کے وزیر قانون کے نام تحریر کیا تھا۔ جو لوگ سرزمینِ پاکستان میں اسلامی دستور اور شرعی قانون کا مطالبہ کر رہے ہیں یا اس مطالبہ سے ہمدردی رکھتے ہیں وہ اس مراسلے کو بالکل آپ بیتی محسوس کریں گے حتیٰ کہ اس میں دو چار جگہ جہاں "مصر" کا لفظ آیا ہے اسے اگر "پاکستان" کے لفظ سے بدل دیا جائے تو یہ تصور کرنا بھی محال ہو جاتا ہے کہ یہ داستان پاکستان سے نہیں بلکہ مصر سے متعلق ہے۔ مصر میں جس کشتِ عمل کو امام شہیدؒ اور اُن کے رفقاء نے اپنے خون سے سینچا تھا، انشاء اللہ وہ بارآور ہو کر رہے گی۔ اللہ نے چاہا، تو پاکستان میں بھی دارو رسن اور قید و بند تحریکِ اسلامی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گے۔

وما ذالك على الله بعزیز]

اسلامی قانون کی اہمیت | ہم اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ ہماری قوم کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اسلام کی تعلیمات و ہدایات کا اتباع کرے۔ اس کے حق میں بے شمار دلائل موجود ہیں۔ آپ کے سامنے ان دلائل کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ الحمدللہ آپ اس نظریے کے خود بھی قائل ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا اولین۔ اہم ترین شعبہ قانون ہے اس وقت ہم اور آپ میدانِ عمل میں ہیں اور ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کریں۔ اس وقت وزارتِ قانون کا قلمدان آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ اس بات کی قدرت رکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کی اُن تمناؤں اور آرزوؤں کو بار آور کریں جن کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہیں۔ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ مصر کے قانون اور عدالتی نظام کو شریعتِ اسلام کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ چونکہ آپ بھی ایک دائرے میں رعیت کے راعی ہیں، اس لئے اس سلسلے میں آپ خدا و خلق کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہیں۔

اس قوم کے افراد جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس ملک میں اللہ کے قانون کے خلاف فیصلے کئے جاتے ہیں تو وہ اپنے دلوں میں سخت تنگی اور انقباض محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں صبر کا پیمانہ لبریز ہو

جانے کے بعد چھلک جاتا ہے اور اندر ہی اندر جو مادہ پک رہا ہوتا ہے وہ بسا اوقات پھوٹ نکلتا ہے۔ سب سے زیادہ خطرناک تصادم کی صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ ایک قوم کا ذہن حق کے اصول اور باطل کے نظریات کی رزمگاہ بن جاتا ہے۔ ہمارے موجودہ ملکی قوانین اور اسلام کے قوانین ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں جابجا ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابنائے قوم کے دل و دماغ میں ایک اضطراب اور بے چینی رونما ہو رہی ہے اور وہ اس تضاد کو بری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ مسلمانوں کو قوانین کی بے احترامی اور خلاف ورزی پر مجبور نہ کریں اور حالات کو بدلنے کی کوشش کریں۔ آئیے ہم اللہ کے حضور میں حاضر ہوں اور اس بارے میں اس کے ارشادات کو سنیں

کیا یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں ہے؟ :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء : ۶۵)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم، وہ نہیں ایمان لا سکتے جب تک کہ وہ تجھے حکم نہ بنالیں اپنے تنازعہ فیہ معاملات میں پھر وہ اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ محسوس کریں تیرے فیصلے پر اور سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔

وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَّفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ أَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۗ وَإِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُوْنَ ۝ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔	اور یہ کہ تم فیصلہ کرو اُن کے مابین اُس کے مطابق جسے اللہ نے اُتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور اُن سے چوکنے رہو مبادا وہ تمھیں بہکا دیں تم پر اللہ کے نازل کردہ بعض احکام سے۔ اگر وہ مُنہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ انھیں ان کے بعض گناہوں پر عذاب دینا چاہتا ہے۔ اور یقیناً لوگوں میں سے بہت سے فاسق ہیں۔ کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ اور کون ہے بہتر اللہ سے فیصلے میں یقین رکھنے والوں کے لئے۔

(المائدہ ۵: ۴۹، ۵۰)

مذکورہ بالا آیات المائدہ کے جس رکوع سے لی گئی ہیں وہ سارا اسی موضوع پر ہے۔ اس کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں . . . وہی ظالم ہیں . . . وہی فاسق ہیں۔

إِنَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ	ہم نے نازل کی ہے تم پر کتاب حق

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ	کے ساتھ تاکہ تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان
النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا	اُس کے مطابق جو تمھیں اللہ نے دکھایا ہے
تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۔	اور خائنوں کے طرفدار نہ بنو ۔

(النساء: ۱۰۵)

موجودہ تضاد و تناقض | یہ تو ہیں کلی اور عمومی احکام، لیکن ان کے علاوہ قرآن میں بہت سے تمدنی، تجارتی، فوجداری، بین الملّی اور اسی قبیل کے دوسرے احکام ہیں جو جزئیات سے متعلق ہیں اور اُن کی مزید تفصیل و تائید احادیث صحیحہ میں ملتی ہے۔ ان تمام احکام کی غرض یہی ہے کہ مسلمان ان پر عمل پیرا ہوں اور اپنے تنازعوں کا فیصلہ ان کے مطابق کریں۔ اب اگر آپ اپنے ملک کے دستور اور قانون پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا مأخذ اور سرچشمہ کتاب و سنّت نہیں بلکہ یورپ کے ممالک (بلجیم، فرانس، اٹلی وغیرہ) کے دساتیر اور قوانین ہیں۔ ہمارا دستور و قانون کلیات کے اعتبار سے بھی اور جزئیات کے لحاظ سے بھی اسلام سے صریح طور پر متصادم اور متناقض ہے۔ اب غور کیجیے کہ اگر ایک مسلمان کے سامنے ایسا معاملہ آتا ہے جس کا فیصلہ اسلام کی رُو سے کچھ اور رہے اور موجودہ قانون کی رُو سے کچھ اور، تو اُس وقت وہ مسلمان کونسا موقف اختیار کرے گا۔ پھر غور کیجیے کہ اس ملک کے مجسٹریٹ، جج، چیف جسٹس اور وزیرِ عدالت کے لئے

احکم الحاکمین کے احکام کی مخالفت کیسے جائز اور حلال ہوگی۔

میں آپ سے پرزور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس تضاد اور تناقض کو دور کریں، ہمیں اس گرداب بلا سے نجات بخشیں اور اعمال اور عقائد کے اس ٹکراؤ کو ختم کریں۔ یہ چیز میرے علم میں ہے کہ بکثرت مسلمان اپنے جائز جانی و مالی حقوق سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور بہت سے نقصانات کو محض اس لئے گوارا کر لیتے ہیں کہ وہ ایسی عدالت اور ایسے قاضی کے سامنے جانا حرام سمجھتے ہیں جو خلاف شریعت فیصلے صادر کرے۔ اس صورت حال کے نتائج بڑے خوفناک ہیں اور یہ اللہ سے بغاوت ہے بلکہ بڑا سخت گناہ ہے۔ میرا یہ فرض ہے کہ آپ کو توجہ دلاؤں اور یاد دہانی کراؤں کہ اللہ کے سامنے عذرات کچھ کام نہیں آئیں گے۔ اللہ کی نظر اعمال پر بھی ہے اور نیتوں پر بھی۔

شرعی قوانین کا تفوق | یہ تو اس معاملے کا باطنی پہلو ہے جس کا تعلق ہمارے ایمان اور عقیدے سے ہے لیکن اگر قانون کے خالص ظاہری نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تب بھی ملکی و غیر ملکی، مسلم و غیر مسلم دونوں قسم کے ماہرین قانون نے اعتراف کیا ہے کہ شریعت اسلامیہ قانون سازی کا ایک نہایت شاندار جامع اور بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ فرانس کے متعدد قانون دانوں نے اپنی قوم کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے قوانین میں شریعت اسلامیہ کے مطابق

ترمیم کریں اور کئی بین الاقوامی اجتماعات میں مقننین نے قوانینِ اسلامی کی تعریف کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ شریعت کی تعلیمات قانون سازی کے بارے میں پورے طور پر کفایت کرتی ہیں۔ یورپ کے غیر اسلامی قوانین کو ہم مصر میں پچاس سال سے زائد عرصے تک برت کر دیکھ چکے ہیں۔ ان کا حاصل جرائم کی کثرت اور روز افزوں اضافے کے سوا کچھ نہیں ہے سنگین اور ہولناک وارداتیں چاروں طرف رونما ہو رہی ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ موجودہ قوانین ہمارے امراض کا مداوا نہیں ہیں اور ہمارے ماحول اور قومی مزاج سے انھیں قطعاً کوئی مناسبت نہیں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے جن ممالک میں چند ایک قوانینِ شرعیہ نافذ ہیں، وہاں ملک کے امن و اخلاق پر ان کے اچھے نتائج مترتب ہو رہے ہیں۔ کیا سرزمینِ مصر کو اس کا موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ بھی قوانینِ اسلامی کی برکات سے مستفید ہو؟

غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ | یہ مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل صاف اور واضح ہے تاہم کچھ لوگ ہیں جو نیک نیتی یا بدنیتی کی بنا پر اس اصلاح کے رستے میں حائل ہیں۔ ان کی طرف سے عموماً چند شبہات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا شبہ یہ ہے کہ مصر میں کچھ غیر مسلم اقلیتیں ہیں۔ اگر یہاں اسلامی احکام نافذ کر دیے جائیں تو اس سے اِن مذہبی آزادی میں مداخلت

واقع ہوگی جس کی دستوری طور پر ضمانت دی جا چکی ہے۔ اور اگر غیر مسلموں کو ان احکام سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو یہ حقوق شہریت میں ایک ناپسندیدہ امتیاز ہوگا جس سے بحمداللہ ہم چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں۔ اس شبہ کے دونوں وجوہ باطل ہیں۔ اگر ملک میں اسلامی احکام نافذ کئے جائیں تو اس سے مذہبی آزادی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ دستور میں اقلیتوں کو جس چیز کی ضمانت دی جاتی ہے وہ عقیدہ، عبادات، شعائر اور احوال شخصیہ کی آزادی ہے۔ قانون ملکی بہرحال اکثریت کی مرضی کا آئینہ دار اور ان کے نظریات کا مظہر ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ قانون کا مصدر کیا ہے، جس قانون پر جمہور متفق ہو جائیں وہی ملک میں رائج ہوتا ہے اور اس بارے میں اقلیت کو اکثریت کی بات مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اقوام یورپ اس بات پر فخر کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ حریت اور شخصی حقوق کا بہت احترام کرتی ہیں اور جمہوریت کی علمبردار ہیں لیکن وہ بھی اپنی اقلیتوں کے ادیان و عقائد کا لحاظ کئے بغیر اپنی منشا کے مطابق قوانین وضع کرتی ہیں۔ فرانس، انگلستان، جرمنی وغیرہ میں ایک فرد تنہا مسلمان ہو خواہ اس کا تعلق ایسی اقلیت سے ہو جس کا دین اکثریت کے دین سے مختلف ہے، وہ ملک کے قانون کی پابندی کرتا ہے۔ اس کے بغیر جمہور کی آزادی اور داخلی و خارجی استقلال متحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر غیر مسلم اپنے شخصی معاملات میں فیصلے اپنے پرسنل لا کے مطابق کریں اور بقیہ معاملات میں قانون موضوعہ

پر عمل کریں تو اس سے کوئی ایسا امتیاز نہیں پیدا ہوتا جو کسی خدشے یا اعتراض کا موجب ہو سکے۔ ہم کسی غیر مسلم کو اس امر پر مجبور نہیں کرتے کہ وہ اپنے پرسنل لا کی پابندی کرے بلکہ ہم اس کا انتظام اس کی اپنی خواہش اور مرضی کی بنا پر کرتے ہیں۔ اس سے مقصود کوئی ناروا پابندی یا حق تلفی نہیں ہے۔ دوسری طرف اگر ہم ملکی قانون کو اقلیت کے مسلک اور نظریے کے مطابق بنائیں تو یہ اکثریت کے حقوق پر ایک شدید ظلم اور زیادتی کے مترادف ہو گا۔ پھر آپ کو معلوم ہو گا کہ بہت سے مسیحی برادرانِ وطن نے بھی یہ مطالبہ کیا ہے کہ بلا امتیاز تمام معاملات میں احکامِ شرعیہ کو ان پر بھی نافذ کیا جائے اور اس بارے میں حق بات اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے کہ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (پس تم مت ڈرو لوگوں سے بلکہ ڈرو مجھ سے اور مت لو میری آیات کے عوض حقیر قیمت)۔

معاشی پیچیدگیوں کا بہانہ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین کا اجرا عملاً ناممکن ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ہم سود کا ابطال کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ہم بین الاقوامی اقتصادی نظام کی جکڑ بندیوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض بھی بالکل بے اصل ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض قوی العزائم قوموں نے اپنے لئے مخصوص اور منفرد معاشی نظام وضع کئے ہیں اور ساری دنیا کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان کا احترام کریں۔ اس معاملے میں فیصلہ کن شے حکومت

کی قوتِ ارادی اور قوم کی عملی استعداد ہے۔ اس بارے میں جو چیز ہماری راہ میں رکاوٹ ہے وہ صرف عزم کی کمزوری اور موہوم خطرات کا بے جا خوف ہے۔ ہماری قوم اللہ کے فضل سے ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہم زندگی کی جملہ ناگزیر ضروریات خود پیدا کر سکتے ہیں اور اس بارے میں ہمیں اغیار کا دستِ نگر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہمارے ارادے مضبوط ہو جائیں تو ہم اقوامِ عالم کے علی الرغم اپنے مالی نظام کو استوار رکھ سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ اٹلی پہ ایک وقت ایسا آیا ہے جبکہ اُس پر چاروں طرف سے باون اقوام نے یورش کر دی تھی اور ان میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں بھی شامل تھیں۔ اُنھوں نے مل کر اٹلی پر تاوان عائد کیے تھے لیکن آخر کار اٹلی کی عزیمت کے سامنے ان سب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور قومی غیرت کے سامنے بندوق اور تلوار کی کچھ پیش نہ گئی۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ ہٹلر نے یہ فرمان صادر کر دیا تھا کہ جرمنی کا سونا اور سکّہ جرمنی سے باہر نہیں جائے گا۔ کیا اس سے دوسرے ممالک کے ساتھ جرمنی کا لین دین ختم ہو گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ دوسری قوموں نے اس فیصلے کا احترام کیا اور مبادلے کے اصول پر جرمنی سے معاملہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ دونوں قومیں طاقتور تھیں اور ہم کمزور ہیں۔ اس طرح کے معاملات میں فوج کشی اور لشکر آرائی تک نوبت شاذ و نادر

ہی پہنچتی ہے۔ یہ خرید و فروخت اور لین دین کے مسائل ہیں۔ کوئی قوم خواہ کتنی ہی ضعیف کیوں نہ ہو وہ اس خصوص میں بالکل آزاد ہے، بشرطیکہ وہ یکسو ہوکر اپنے مطمحِ نظر کو واضح کر دے اور پھر ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر جم جائے۔

دوسری قومیں تو صرف یہ چاہتی ہیں کہ ہم اُن کے ساتھ شریف آدمیوں کا سا معاملہ کریں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ قرض کا کاروبار کرنے والے بہت سے بنک اور دوسرے ادارے برابر کے لین دین پر رضامند ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ ادائگی یقینی ہو جائے۔ اس لیے ایک طرف اگر ہم سُود کو قانوناً ممنوع قرار دے دیں اور دوسری طرف واجبات کی پوری پوری ادائگی کا شدت سے اہتمام کریں تو دوسری حکومتیں اس پر راضی ہو جائیں گی اور ادائے حقوق کی ضمانت کے بعد وہ سُودی لین دین پر اصرار نہیں کریں گی خصوصاً جبکہ انھیں بتایا جائے گا کہ سُود تمام مذاہبِ عالم کے نزدیک حرام ہے۔ آخر کیوں نہ مصر کو اس شرف میں سبقت حاصل ہو کہ وہ دُنیا کو سُود کی لعنت اور خباثت سے نجات دلانے کی جدوجہد کرے اور کیوں نہ مصری حکومت نوعِ انسانی کے لیے اس نویدِ رحمت کی پیامبر ثابت ہو۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ کی قومیں بردہ فروشی کو اپنی تہذیب و معاشرت کے لئے بالکل اسی طرح ضروری سمجھتی تھیں جس طرح آج وہ سُود

کر سکتی ہیں۔ انھی میں سے بعض نے اس کاروبار کو ختم کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور آخر کار دوسری قوموں نے بھی اس کی نامعقولیت کو تسلیم کر کے اسے ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔ کل اگر بردہ فروشی کے خلاف علم بلند کیا جا سکتا تھا تو آج کیا سُود کے خلاف جہاد نہیں کیا جا سکتا؟ اس بارے میں آخر خوف و یاس ہمیں کیوں لاحق ہو؟ کیا آج ہم انسانیت کی خدمت سے بالکل عاجز ہو چکے ہیں؟ حالانکہ کل تمام دُنیا میں علم و عرفان کی روشنی پھیلانے والے ہم ہی تھے۔ یہ محض شاعری یا خیال آرائی نہیں ہے بلکہ یہ حقائق ہیں جنھیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اگر ہم سُود کو ترک کر دیں تو یہ امر ہماری اقتصادی خود مختاری کا باعث ہوگا اور ہماری قوم جو اغیار کے سہاروں پر چلنے کی عادی ہو چکی ہے اس میں خود اعتمادی، عزتِ نفس اور دوسروں سے بے نیازی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور قیمتی موقع آخر کونسا ہوگا۔ ہماری قوم ایک دینی مزاج رکھتی ہے اور دینی محرک اور آمادۂ عمل کرنے کے لیے دینی عوامل سب سے زیادہ کارگر ہو سکتے ہیں۔ سُود کی تحریم سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوگا کہ ہماری غریب قوم قسمی انقلاب سُود خوار لٹیروں اور قزاقوں سے گلو خلاصی حاصل کر لے گی۔

شرعی حُدود و تعزیرات کے خوف | ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر قوانینِ شرعیہ کا

نفاذِ عمل میں لایا گیا تو چوروں کے ہاتھ کٹنے شروع ہو جائیں گے، زانیوں کو سنگسار کیا جایا کرے گا، ہماری قوم دورِ وحشت کی طرف لوٹ جائے گی، تہذیب و ترقی کی رفتار یک قلم رُک جائے گی اور ہمارا شمار غیر متمدن قوموں میں ہونے لگے گا۔ یہ اعتراض بھی بالکل بے حقیقت ہے اور دراصل یہ ایسے افراد کے ذہن کی پیداوار ہے جو نظمِ اجتماعی کو درہم برہم کرنے کے درپے ہیں، زندگی کے ہر گوشے میں مطلق اباحیت اور بے قیدی کے خواہش مند ہیں، دوسروں کی جان و مال اور عزت و ناموس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں اور اس اندیشے نے ان کی نیند حرام کر رکھی ہے کہ کہیں اسلام کی قربان گاہ پر سب سے پہلے انھیں بھینٹ نہ چڑھا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ جرائم کی کثرت کو تمدن و ارتقا کی علامت قرار دے دینا صحیح ہے اور نہ اُس قانون کو رجعت پسندانہ اور سنگدلانہ سمجھ لینا درست ہے جو جرائم و فواحش کا استیصال کرے۔ ایسا قانون تو تہذیب و ترقی کا عین مظہر ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان فاسد افکار و نظریات کو ختم کیا جائے۔ مصلحینِ اسلام کے لئے یہ موقع شرمانے کا نہیں بلکہ آگے بڑھ کر کام کرنے کا ہے۔ آج کل نظریات ایسے بدلے ہیں کہ قانون کی ہمدردی مجرم کے حق میں زیادہ اور معاشرے کے حق میں کمتر ہو گئی ہے مجرم کے ساتھ سختی کے بجائے نرمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہولناک جرائم چار سو پھیل چکے ہیں اور پھیل رہے ہیں، قانون ان کے مقابلے میں

بالکل عاجز اور بے بس ہے۔ قومی کمائیوں اور محنتوں کا بیشتر حصہ پولیس، قید خانوں اور عدالتوں میں صرف ہو رہا ہے لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ اس وقت فلسفۂ جرم سے متعلق خوشنما بحثوں اور لاطائل استدلالات کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ضرورت جرم کے عملی سدِباب اور روک تھام کی ہے۔

چند دیگر اعتراضات | یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ میں ایک عملی مشکل یہ ہے کہ ایسی جامع شخصیتوں کا ملنا محال ہے جو بیک وقت اسلامی علم و عمل سے آراستہ ہوں۔ حاملینِ دین قانون کی تدوین و تنفیذ کے جدید تقاضوں سے بے خبر ہیں اور قانون دان دین کا علم نہیں رکھتے اور جب تک مردانِ کار پیدا نہ ہوں قانونِ اسلامی کو مفید اور مناسب شکل میں کیسے رائج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے اور اس مشکل پر قابو پا لینا بالکل سہل ہے۔ اللہ کے فضل سے ایک طرف ہمارے علماءِ دین میں بہت سے حضرات ایسے ہیں جن کی قانونِ جدید پر بھی وسیع نظر ہے اور دوسری طرف ہمارے ہاں قانون کے بہت سے ماہرین ایسے موجود ہیں جنھیں اسلامی فقہ و تشریع سے پورا پورا شغف ہے اور جنھوں نے اس سلسلے میں بڑی محنت سے اسلامی اور غیر اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اپنی تحقیق کے نتائج ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔

پھر ایک اعتراض ایسا بھی وارد کیا جاتا ہے جو خالص مادی نقطۂ نظر اور مصالحِ شخصی پر مبنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شرعی قانون پر اصرار کرنے والے در پردہ "عدالت ہائے شرعیہ"[1] پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور ان کے ارادے یہ ہیں کہ "عدالت ہائے اہلیہ" میں کام کرنے والوں کی کثیر تعداد کو بالکل بیکار و بے روزگار بنا دیں، یہ چاہتے ہیں کہ ایک خاص گروہ سارے عدالتی مناصب سنبھال لے اور دوسروں کو ان سے بالکل محروم کر دے۔ عدالت ہائے اہلیہ کا نظام بہت وسیع، دقیق اور ہمہ گیر ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ شرعی عدالتوں کے چند جج ایسی کٹھن ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

یہ اعتراض بھی بالکل لغو اور پوچ ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ایک خاص قسم کا علم کسی خاص طبقے کی اصلی میراث ہے؟ کیا ہر ذہین آدمی کی رسائی ہر علم و فن تک نہیں ہو سکتی؟ ہمیں اس بات سے بھی کامل اطمینان ہے کہ دونوں قسم کی عدالتوں کے مجسٹریٹ اور جج صاحبان اگر چند ماہ بھی باہمی تدریس و تربیت پر صرف کریں تو وہ قانون کے سارے شعبوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ آدمی جس راہ پر بھی پیش قدمی کرنے کا پختہ ارادہ کر لے، وہ راہ اس

---

[1] مصر کا عدالتی نظام دو حصوں میں منقسم تھا: "اہلیہ" عدالتیں عام قانونِ ملکی کی نگران تھیں اور شرعیہ عدالتیں صرف پرسنل لا کی قسم کے معاملات میں فیصلے دینے کی مجاز تھیں۔ مگر اب جنرل ناصر نے شرعی عدالتوں کو ختم کر دیا ہے۔ (مترجم)

کے لئے ہموار ہو جاتی ہے۔ ہم کسی بھی فرد یا گروہ کی بے جا طرفداری یا عداوت میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہم تو اس تفریق اور ردعملی کو ہی سرے سے مٹا دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اہلی و شرعی امتیازات یک قلم ختم کر دیئے جائیں اور عدالت کا ایک کلی اور وحدانی نظام قائم کیا جائے۔ اور اس کے لئے اصل بنا اور ماخذ شریعت الٰہی کو قرار دیا جائے۔

یہ چند شبہات میں نے آپ کے سامنے نمونۃً رکھے ہیں اور ان کے مختصر جوابات بھی دے دیئے ہیں۔ ان سے بآسانی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ قانونِ شرعیہ کے نفاذ سے متعلق جن شکوک و اعتراضات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وہ کتنے بے اصل اور بے بنیاد ہیں۔ یہی حال ہر اس اعتراض کا ہوتا ہے جس کی پشت پر نفسانی اغراض اور حق سے اعراض کا جذبہ کارفرما ہو۔

"الاخوان المسلمون" کا مطالبہ یہ ہے کہ ہماری حکومت شریعت اسلامیہ کی طرف لوٹے اور قانونِ مصری کے نظام کو فوراً شریعت کی بنیادوں پر استوار کرے۔ ہم ایک مسلم قوم ہیں۔ ہم نے عزم کر لیا ہے کہ ہم صرف اللہ کے قانون اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی حکمرانی اور بالادستی تسلیم کریں گے، خواہ ہمیں اس کی بھاری سے بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑے اور بڑی سے بڑی قربانی بھی پیش کرنی پڑے۔ ایک آزاد اور خود مختار مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا فطری حق ہے اور سیاسی و اجتماعی شوکت و استقلال

کا کوئی دُوسرا مظہر اس کا بدل اَور قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ آپ بھی اس حق کے حصُول میں ہماری مدد کیجیے۔ اس صُورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کیجیے اَور قوم کو مجبور نہ کیجیے کہ وُہ کسی اَیسے راستے پر پڑ جائے جس پر مایُوسی اَور اضطرار کی حالت میں عمُوماً قومیں پڑ جایا کرتی ہیں۔

کیا قانونِ ملکی کی بنا دین پر رکھنا مضر ہے؟

(الشیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء پروفیسر اسلامک لا کالج شام)

جب قانونِ ملکی کے نظام کو دین اور شریعت کی بنا پر استوار کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس پر عموماً دو بڑے اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر شریعت کو قانون کی بنا قرار دے دیا جائے تو اس میں عدمِ ارتقاء، جمود اور تعطل کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قانونِ شریعت میں اتنے فقہی اختلافات ہیں کہ اسے قانونِ ملکی کا مأخذ بنانا عملاً دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک مختصر بحث میں ان اعتراضات کا جواب دیں اور اس بارے میں اسلامی قوانین کی صحیح حیثیت کو واضح کر دیں۔

عدمِ ارتقاء اور جمود کا الزام پہلا اعتراض کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر قانون کی بنا دینی تعلیمات پر رکھ دی جائے تو اس میں تغیر و تبدل ناممکن ہو جائے گا اور قانون کی ترقی بالکل رک جائے گی۔ اس طرح کے قانون میں یہ صلاحیت

ہرگز نہیں ہوگی کہ وہ بدلتے ہوئے زمانی و مکانی حالات کا ساتھ دے سکے۔
یہ اعتراض کوتاہ نظری، کم فہمی اور قانونِ اسلامی سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔
اسلامی قوانین کا ایک حصّہ وہ ہے جو براہِ راست آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ کے نصوص پر مبنی ہے۔ اس حصّے کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خدائے علیم و خبیر کی جانب سے نازل شدہ ایسی وحی و الہام پر مبنی ہے جس میں قیامت تک کے لئے انسانی ضروریات و مقتضیات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے
اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زندگی کے ہر گوشے سے متعلق اصولی اور بنیادی حدود کار متعیّن کئے گئے ہیں اور ان حدود کے دائرے میں عمومی رہنمائی دے کر انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لئے اس منصوص اور بنیادی حصّۂ قانون میں ارتقا یا تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان قوانین کے علاوہ قوانین کا ایک بڑا حصّہ ایسا ہے جو اسلام کی اصولی ہدایات کو مدِّنظر رکھ کر قیاس، استحسان، مصالحِ عامّہ اور عرفِ عام کے اصول پر وضع کیا گیا ہے اور اب بھی اور آئندہ بھی انھی اصولوں کو مدِّنظر رکھ کر ہر زمانے اور ہر ماحول کے لحاظ سے اس میں تبدیلی اور ترقّی کی پوری پوری گنجائش موجود ہے۔ فقہا نے صرف تمدّنی حالات کے نشو و نما کی وجہ سے ہی احکام میں تبدیلی نہیں کی ہے بلکہ انھوں نے فسادِ زمانہ اور اخلاقی و دینی انحطاط کو بھی احکامِ فقہی کے تغیّر کی ایک

وجہ قرار دیا ہے۔

شرعی قوانین کا باطنی اور اخلاقی پہلو | قانون کی اساس اگر دین اور شریعت رکھی جائے تو اس سے قوانین کے اندر ایک نوع روحانی اور خصوصیت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جو عام لادینی وضعی قوانین کے اندر کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ خصوصیت معاملات کی حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کا وہ دینی تصور ہے جو ان سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک قاضی اگر ظاہری بیانات و شہادات کو دیکھ کر کسی فریق کو اس کے جائز حق سے زائد یا اس سے علاوہ کچھ دلا دیتا ہے تو فی الحقیقت اس فریق کے لئے یہ ناجائز فائدہ ہرگز جائز اور حلال نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک مرتبہ ایسا ارشاد فرمایا تھا کہ اگر تم میں دو فریقین میرے سامنے کوئی قضیہ پیش کریں تو ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک آدمی زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کی باتوں کی بنا پر اسے غیر کا حق دلا دوں لیکن یہ چیز اس شخص کے لئے عذاب کی موجب ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی قانون پر مبنی عدالتیں بھی فیصلہ ظاہر حالات ہی پر کریں گی، لیکن جن لوگوں پر قانون کا اطلاق اور نفاذ ہوتا ہے ان کے حق میں قوانین و احکام کا باطنی اخلاقی اور دینی پہلو کالعدم نہیں ہو جاتا، اس لئے اگر وہ سچے مسلمان ہیں تو قانون کی روح کے بھی خلاف جانے اور اس سے ناروا استفادہ کرنے سے

وُہ ہمیشہ سختی سے پرہیز کریں گے۔ عام دُنیوی قوانین کے ظاہر کی آڑ میں ان قوانین کے اصل منشا کو ناکام بنانے کی کوششوں سے جو تکلیف دِہ صورتِ حال عام معاشروں میں پیدا ہو جاتی ہے، وُہ صورتِ حال ایک صحیح اِسلامی معاشرے میں اِسلامی قانون کے نفاذ کے وقت کبھی رُونما نہیں ہو سکتی۔

اِسلامی قوانین کے اندر ایک طرف تو حلال و حرام کی تمیز کا تصوّر بنیادی طور پر کارفرما ہے اور دُوسری طرف تفصیلی احکام مدنیہ میں دُنیوی و مادّی مصلحت اور عُرفِ سلیم کا لحاظ بھی بہرحال رکھا جاتا ہے۔ اِس طرح سے قانون کے سارے ڈھانچے پر ایک دینی اور رُوحانی رنگ غالب آجاتا ہے اور اُسے ایک ایسا احترام، وقار اور تقدّس حاصل ہو جاتا ہے جو انسانی قوانین کے کسی مجموعے کو نصیب ہونا ناممکن ہے۔ اسلامی قانون کی حکمرانی فقط جسم کے اعضاء وجوارح پر نہیں ہوتی، بلکہ اُس کی اصل حکومت دل اور دماغ پر ہوتی ہے۔ اس صُورت میں اس چیز کی ضرورت بہت کم رہ جاتی ہے کہ قانون کی ظاہری طاقت انسان کو ہر وقت اطاعت و تسلیم پر مجبور کرتی رہے۔ قانون کی خلاف ورزی کا کوئی موقع اگر پیدا ہوتا بھی ہے تو اُسے غنیمت سمجھ کر استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ محض خدا سے ڈر کر نفس کو اتباعِ ہوٰی سے روک لیا جاتا ہے۔ احکامِ منصوصہ کا تو من جانب اللہ ہونا بالکل واضح

ہے لیکن فقہا کے اجتہادات کو بھی اگر شریعت کی جانب منسوب کر کے ایسا قوانینِ شرعیہ کے تحت ہی شمار کیا جائے تو یہ نسبت بالکل صحیح اور معتبر ہوگی۔ ان اجتہادات کے اختلاف اور تفاوت کے باوجود ہمیشہ ہم ان میں سے ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح، ایک کو افضل اور دوسرے کو مفضول اسی وجہ سے قرار دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک اجتہاد دوسرے کی نسبت ہمیں شریعت کے اصل ماخذ ـــــ کتاب و سنت ـــــ سے اقرب اور اوفق نظر آتا ہے۔ یہ اجتہاد در اصل وہ تخریج و استنباط ہے جسے شریعت کے اصول و نصوص کی روشنی میں سرانجام دیا گیا ہے۔ ان اجتہادات کی مثال بالکل لغوی مشتقات کی سی ہے۔ ایک لفظ سے اگر بہت سے الفاظ اور صیغہ جات کو مشتق کیا جائے تو ان تمام کے بارے میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے گا کہ ان کی اصل ایک ہی مادہ ہے اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان میں باہمی منافات ہے۔

شرعی قانون کی معرفت اسلامی قوانین کی صحیح معرفت اور ان کی قدر و قیمت کی آگاہی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی اساس اور اصل ماخذ کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا جائے۔ جب تک ہم فروع کو اصول کی روشنی میں، نتائج کو مقدمات کی روشنی میں، احکام و آثار کو مقاصد و غایات کی روشنی میں نہیں دیکھیں گے ہمیں اسلامی قانون کا فہم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے بنیادی عقائد و

نظریات کے پس منظر سے الگ کرکے اس کے قوانین کے حُسن و قبح کا تصوّر کرنا ایسا ہے جیسے کوئی جڑ اور تنے سے نظر ہٹا کر پتّوں اور شاخوں کا جائزہ لینا شروع کر دے۔ اسلام نے دین و اخلاق کے ساتھ قانون کا ایک مضبوط اور لاینفک ربط پیدا کیا ہے۔ عام فلاسفہ، حکما اور مصلحین کے لئے اخلاقیات محض خوش فکری اور ذہنی بلند پروازی کا ایک ذریعہ تھیں، جب انھوں نے نظریات کی دُنیا سے نکل کر عملیات و واقعات کی دُنیا میں قدم رکھا ہے تو عموماً ان کے ہوائی قلعے مسمار ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اسلام نے اخلاقی بنیادوں پر سیاسی قوانین کی ایک ایسی عظیم الشان اور مستحکم عمارت تعمیر کی ہے جس کے سائے میں انسانیت کے سارے اعلیٰ اخلاقی اور معاشرتی تقاضے احسن طریق پر پُورے ہو سکتے ہیں۔

شرعی قانون کی بالادستی | ہمارے فقہی قوانین کے دینی سرچشموں سے سیراب ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ راعی اور رعایا سب یکساں طور پر غالب اور بالادست ہیں اور ان کے سامنے حاکم اور محکوم دادرسی اور جوابدہی کے لئے ایک ہی صف میں آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ رعایا کے ہر فرد کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حکام کو دوبدو مخاطب کرکے کہے کہ تم بھی احکامِ شریعت کی پابندی سے بالاتر نہیں ہو۔ واقعہ بھی یہی ہے اور تاریخ اسی بات کی شہادت دیتی ہے کہ جس زمانے میں مسلمانوں کا کوئی لکھا ہُوا ملکی دستور یا قانون نہیں تھا۔ اُس وقت بھی

حاکم و محکوم دونوں کو احکم الحاکمین کے فرامین کے سامنے سرِ اطاعت خم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ صرف خلفائے راشدین کے دور ہی میں نہیں بلکہ بعد کے ادوار کی بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ خلفاء قاضی کی عدالت میں عام شہریوں کی طرح مدعی اور مدعاعلیہ کی حیثیت میں حاضر ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ "الذهب المسبوك من سير الملوك" میں نمیر المدنی کا ایک واقعہ ان کی اپنی زبان سے منقول ہے اور وہ یہ ہے:۔

"منصور ایک مرتبہ مدینے آئے۔ محمد بن عمر الطلحی اس وقت قاضی مدینہ تھے اور میں اُن کا سکرٹری تھا۔ کچھ مزدوروں نے آکر عدالت میں امیرالمومنین کے خلاف ایک دعویٰ دائر کیا۔ قاضی محمد نے مجھے حکم دیا کہ میں منصور کو لکھوں کہ وہ فلاں تاریخ کو عدالت میں حاضر ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے معاف رکھا جائے کیونکہ خلیفہ میرا خط پہچانتے ہیں۔ قاضی نے فرمایا کہ تم ہی لکھو۔ چنانچہ میں نے حکمنامہ لکھا اور انھوں نے اپنی مہر اس پر ثبت کی، پھر مجھ سے کہنے لگے "خدا کی قسم، تمھارے سوا اسے کوئی اور نہ لے کر جائے"۔ میں ربیع کے پاس اسے لے کر گیا اور معذرت چاہنے لگا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ ربیع خلیفہ کے پاس گئے۔ پھر باہر آکر کہنے لگے۔ "امیرالمومنین لوگوں کو سلام کہتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ مجھے قاضی کے ہاں طلب کیا گیا ہے۔ کوئی آدمی وہاں جانے پر تعظیماً میرے لئے کھڑا نہ ہو اور نہ مجھے سلام کرنے میں سبقت کرے (یعنی میں خود سلام میں پیش دستی کروں گا)۔ اس وقت مدینے کے بہت سے معززین موجود تھے۔ چنانچہ خلیفہ تہمد اور چادر میں ملبوس آگئے آگے چلا مسیّب اور ربیع آگے تھے اور میں پیچھے منصور نے لوگوں کو سلام کیا اور کوئی آدمی اُن کے لئے حاضرین میں سے نہ اُٹھا۔ پھر منصور نے ربیع سے کہا "خدا کی قسم، اگر محمد بن عمر میرے احترام میں اُٹھے تو وہ کبھی قاضی نہیں رہ سکیں گے"۔ قاضی ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ جب اُنھوں نے خلیفہ کو دیکھا تو چادر لپیٹ لی۔ پھر فریقین کو بلایا، بیانات لئے اور خلیفہ کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔

منصور جب گھر پہنچے تو ربیع سے کہنے لگے کہ جاؤ اور جب مدعی چلے جائیں تو قاضی کو میرے ہاں آنے کی دعوت دو۔ ربیع نے خلیفہ سے کہا کہ قاضی نے آپ کو سب لوگوں سے فارغ ہو کر بلایا ہے۔ جب قاضی منصور کے پاس آئے تو خلیفہ کہنے لگے "اللہ تعالیٰ آپ کے دین و اخلاق کے عوض میں آپ کو جزائے خیر دے"۔

فقہی اختلافات | شریعت کو قانون کی بنا قرار دینے پر جو دوسرا اعتراض کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اسلام کے فقہی اجتہادات میں ایسے اختلافات ہیں، جو

تناقص اور تضاد کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ ان تناقصات کی موجودگی میں اسلام کے قانون کو ملک میں رائج اور نافذ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ یہ اعتراض بھی علم و بصیرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اختلاف اگر اصول اور عقائد میں پایا جائے تو بلاشبہ وہ ایک ناپسندیدہ اختلاف ہے جو کہ تضاد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہماری اُمت میں اختلاف اگر ہے تو وہ صرف احکامِ مدنیہ کی عملی تفصیلات اور جزئیات میں ہے۔ یہ اختلاف ہمارے اندر کوئی تصادم اور خلفشار پیدا نہیں کر سکتا بلکہ یہ ہمارے قانونی سرمائے کے اندر وسعت اور تنوّع کا باعث ہے اور اس میں منفعت، لطافت اور جزرسی کے پہلو کا اضافہ کرتا ہے۔ اگر قانون کے اندر اس طرح کا توسّع موجود نہ ہو تو انسان کو بڑی تنگی اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امام شاطبی اپنی کتاب "الاعتصام" میں فرماتے ہیں: "ابن وہب نے قاسم ابن محمد سے نقل کیا ہے کہ عمر بن عبد العزیز فرمایا کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کرام کے اختلاف کو میں ایک پسندیدہ امر خیال کرتا ہوں، کیونکہ اگر ہر معاملے میں ایک ہی قول ہوتا تو لوگوں کو بڑی سخت دشواری پیش آتی۔ اب تو یہ صورت ہے کہ اصحاب سب ائمہ و مقتدا ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ خود

صحابہ کرامؓ نے کھولا ہے اور اجتہاد میں اختلاف کو جائز قرار دیا ہے۔ اگر باب اجتہاد اس طرح وا نہ ہوتا تو بعد کے مجتہدین کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے خود چاہا کہ "خلافِ فروعی" اُمّت کے لئے جائز اور ممکن ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ چیز ہمارے لئے رحمت کا موجب قرار پائی۔"

فروع کے اندر صحابہ کرامؓ کا اختلاف قطعی اخلاص اور دل حسنِ نیت پر مبنی تھا، اس لیے ان میں باہمی نزاع، تعصب اور تحزب کا وجود بالکل ناپید تھا۔ وہ ہمیشہ حق اور صواب کے طالب رہا کرتے تھے اور ہر پہلو اور ہر جہت سے اسی نصب العین تک پہنچنے کی سعی کرتے تھے۔ اس اجتہاد و اختلاف کے نتیجے میں اُن کی استخراج اور استنباط کی قوتیں جلا پاتی تھیں، اور اُن کے اندر دقتِ نظر، باریک بینی اور زود فہمی کا مادہ نشو و نما پاتا تھا۔ درحقیقت یہ اختلافِ رائے ایک لازمی، فطری اور مطلوب نتیجہ تھا قرآن و سنّت کی اُن تعلیمات کا جن میں مسلمانوں کو عقل، تدبّر اور بصیرت کے استعمال کرنے کی اور باہمی مشاورت، تبادلۂ خیال اور مذاکرے کی دعوت دی گئی ہے۔

اختلاف مذموم نہیں اختلاف فی نفسہٖ کوئی بُری یا مذموم شے نہیں ہے ہم دیکھتے ہیں کہ فرنگی علمائے قانون اپنے اُس قانونی ورثے پر اظہارِ فخر کرتے ہیں جو اُن کو اہلِ روما سے ملا ہے۔ قانون کا یہ ذخیرہ درحقیقت رومانی مقننین اور اُن کے

شارحین کے اقوال و آرائیں جن میں سے اکثر ایک دُوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں۔ لیکن یورپ کے قانون دان اس اختلاف کے باوجود اس میراث کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلامی فقہ اور رومن لاء کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو باسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ افادیت، وُسعت، اور داخلی ربط و موافقت کے اعتبار سے مؤخر الذکر کو اوّل الذکر سے دُور کی بھی نسبت نہیں دی جاسکتی۔ جب تک انسانی فہم و شعور اور فکر و نظر میں ایک مشینی قسم کا اتحاد اور یکسانیت نہ پیدا ہو جائے اور جدّت اور اُپج انسان کی فطرت سے بالکل معدوم نہ کر دی جائے، اُس وقت تک اختلافات کا باقی رہنا ایک قدرتی اور ناگزیر امر ہے اس لئے اصول میں اتحاد کے باوجود مجتہدینِ اُمت کا فروع میں اختلاف قائم رہے گا۔ اسے تناقض کا نام دینا سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ ایک ہی دستوری اور قانونی نظام کے تحت عدالتیں جو مختلف فیصلے کرتی ہیں یا اہلِ قانون قوانین کی جو مختلف تعبیرات کرتے ہیں، کیا انھیں تناقضات میں شمار کرانا صحیح ہے؟ ہرگز نہیں! یہ اختلافات تو فی الحقیقت ایک طرف مادۂ قانون کی لچک اور دُوسری طرف ماہرینِ قانون کی تطبیقی اور تشریحی صلاحیتوں پر دلالت کرتے ہیں۔

بعض اوقات نص کے فہم و تعبیر اور قیاس کے وجوہ و طرق میں بھی

اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ اختلاف کی یہ شکل بھی بالکل ناگزیر اور فطری ہے اور اس سے ہمارے قانونی اثاثے میں مفید اضافہ ہوتا ہے۔ ذیل میں تعبیرِ نص اور طریقِ قیاس کے تعدد کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے اس طرح کے اختلاف کی صحیح حقیقت و ماہیت واضح ہو جائے گی۔

تعبیر کا اختلاف اور اس کی مثالیں سورۂ بقرہ (رکوع ۳۹) میں معاملات اور لین دین کی توثیق کے لئے کتابت و شہادت کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ۔ یہاں لفظ "مقبوضۃ" کی تاویل و تشریح میں فقہاء کے مابین اختلاف واقع ہوا ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ کا اجتہاد یہ ہے کہ یہ لفظ شرط کا فائدہ دیتا ہے اور شرعاً عقدِ رہن کے متحقق اور منعقد ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شئے مرہونہ کا قبضہ مرتہن کو فوراً دلا دیا جائے۔ گویا اُن کے نزدیک "رہن بالقبض" کے علاوہ رہن کی کوئی دوسری شکل شرعاً صحیح اور معتبر ہی نہیں ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ قرض کے اس طرح کے معاملے میں چونکہ تحصیل قرض "رہن بالقبض" کے ساتھ مشروط ہے، اس لئے اگر معاہدے کے دوران میں ہی مالِ مرہون پر قبضہ نہ ہو جائے تو رہن کا معاملہ کالعدم ہو جائے گا اور صرف قرض کے معاملے کا وجود برقرار رہے گا۔ بیع کا معاملہ البتہ رہن کے معاملے سے مختلف ہے۔ بیع کی صورت میں مجلسِ انعقاد کے اندر فروخت کردہ شے کا قبضہ دلانا ضروری نہیں ہے۔

مالکیہ کا مسلک اس بارے میں مختلف ہے۔ اُن کے نزدیک "مقبوضہ" کا لفظ صفت کے معنی میں آیا ہے، اس لئے عقدِ رہن کی صحت کے لئے قبضہ شرط لازم نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی رہن کا معاملہ منعقد ہو جاتا ہے، البتہ اس کے اتمام اور تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ بعد میں قبضہ دلا دیا جائے۔ گویا اس مسلک کی رُو سے رہن بالقبض دورانِ معاملہ میں بطورِ شرط کے ضروری نہیں، بلکہ معاملہ طے پا جانے کے بعد، راہن کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ مالِ مرہون کو مرتہن کے سپرد کر دے۔

پھر رہن کے بارے میں مذاہبِ فقہیہ کے درمیان ایک اور جہت سے بھی اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا مالِ مرہون دستاویز کی طرح محض توثیق کا کام دیتا ہے یا وہ ایک امانت بھی ہے جس کے ضائع ہو جانے پر اُس کی تلافی بھی ضروری ہے۔ شوافع کا استنباط یہ ہے کہ مالِ مرہون صرف قرض کے تحریری وثیقے کا بدل ہے۔ آیاتِ قرآنی میں کاتب کے نہ ملنے پر اسے ثبوت اور شہادت کے طور پر تجویز کیا گیا ہے۔ اگر اسے امانت بھی قرار دیا جائے تو یہ ایک "امانتِ غیر مضمونہ" ہے۔ یعنی اگر یہ کسی ناگزیر وجہ سے تلف ہو جائے تو اس کی ادائیگی مرتہن پر واجب نہیں ہے اور نہ ہی زرِ رہن میں سے اس کی قیمت کو وضع کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح سے قرض کی دستاویز ضائع ہو جانے کی وجہ سے قرض

ساقط نہیں ہو جاتا، اسی طرح سے مالِ مرہون کے ضائع ہو جانے کا کوئی اثر زرِ رہن پر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے برخلاف احناف کا اجتہاد یہ ہے کہ رہن بالقبض میں "استیثاق" کے ساتھ "استیفا" کا پہلو بھی موجود ہے۔ یعنی ایک طرف تو مالِ مرہون کا وجود معاملے کی توثیق و تصدیق کا کام دیتا ہے لیکن دوسری طرف اس کی حفاظت اور صحیح و سالم واپسی کی ذمہ داری بھی قابض پر عائد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرتہن کے قرض کی وصولی اور بازیابی اس صورت میں بالکل یقینی ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر راہن پر کئی طرح کے قرضے ہوں اور وہ سارے نہ ادا کر سکتا ہو جب بھی مرتہن کو یہ تقدم اور ترجیح حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنا قرض ہر حال میں وصول کر سکتا ہے۔ البتہ حنفیہ نے یہاں ایک مزید نازک اور عمدہ جزئیہ پیدا کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مالِ مرہون کے ضیاع کی صورت میں اس کی قیمت کی مقدار تو زرِ رہن میں سے وضع کی جا سکتی ہے لیکن اگر مالِ مرہون کی قیمت زرِ رہن سے بڑھ جائے تو زائد قیمت "غیر مضمون" ہو گی اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری مرتہن پر نہ ہو گی۔

یہ مثالیں تو تعبیرِ نص کے اختلاف سے متعلق تھیں۔ اب مسائلِ قیاسیہ میں سے ایک مثال کو لیجئے۔ دو آدمی باہمی سرمائے کا اشتراک کرتے ہیں۔ ایک کے پاس دو دینار ہیں اور دوسرے کے پاس ایک دینار ہے تینوں دیناروں کو اس طرح ملا دیا جاتا ہے کہ ان میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

اس کے بعد دو دینار ضائع ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی کے ایک دینار میں دونوں کا حصہ کتنا کتنا ہے۔ اس سوال کا جواب امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس دینار کا دو تہائی دو دینار والے کو ملے گا اور ایک تہائی ایک دینار والے کا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے شراکت کے ظاہری اور مسلّم قاعدے کے مطابق جواب دیا۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ سرمایہ جب باہم مشترک ہو گیا اور اس کے اجزاء میں امتیاز ختم ہو گیا تو اب اس کے ہر جز کا ⅔ دو دینار والے کا ہے اور ہر جز کا ⅓ ایک دینار والے کا ہے۔ اب کل سرمائے میں سے اگر کچھ ضائع ہو گا تو اس کا نقصان تمام حصہ داروں پر بحیثیت مجموعی ان کے حصص کے تناسب سے تقسیم ہو جائے گا اور جو کچھ باقی رہے گا وہ بھی اسی طرح بحصۂ رسدی سارے شرکا پر منقسم ہو گا۔ یہی سوال جب ابن شبرمہؒ سے کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ جو دینار باقی ہے وہ نصفا نصف دونوں شرکا پر تقسیم ہو گا۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ بیان کی کہ کھوئے جانے والے دو دیناروں میں سے ایک دینار یقیناً اُس آدمی کا تھا جس کے پاس دو دینار تھے، اس لئے ضائع ہونے والے دو دیناروں میں سے ایک بہرحال اسی شخص کے حساب میں سے کم کیا جائے گا۔ دوسرے ضائع ہو جانے والے دینار کا معاملہ مشتبہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک کا ہو اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے کا ہو۔ اس لئے اس دینار کا نقصان دونوں کو

حصّہ برابر برداشت کرنا چاہیئے۔ آخر میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ فقہائے کرام کا یہ اختلاف اسی صورت میں ہے جبکہ تین دیناروں میں سے دو دینار ضائع ہوجائیں، ورنہ اگر تین میں سے صرف ایک دینار ضائع ہو تو اس صورت میں بالاتفاق اس کا نقصان شرکا کے سرمائے کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

اِن مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اجتہادی و قیاسی اختلافات کے بارے میں یہ سمجھ لینا بالکل غلط ہے کہ اُن میں تضاد پایا جاتا ہے حقیقت میں یہ تو ائمہ مجتہدین کی وسعتِ فکر و نظر کا ثبوت ہیں اور مختلف قانونی نکات اور احکام کے متنوع پہلوؤں اور گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان تفریعات کی کثرت نے امتِ مسلمہ کے لئے ایسا قانونی سرمایہ فراہم کر دیا ہے جس کی نظیر اقوامِ عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مصلحی احکام پر زمانہ کی تبدیلی کا اثر

(شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء)

فقہائے اُمت اور ائمۂ مجتہدین کے ہاں یہ حقیقت بالکل مُسلّم اور معروف ہے کہ ماحول اور زمانے کے تغیرات شریعت کے مصلحی اور اجتہادی قوانین پر نمایاں حیثیت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے قوانین کا اصل مقصد عدل و انصاف کا قیام، مصالح کا حصول اور مفاسد کا انسداد ہے۔ اس لئے حالاتِ زمانہ اور اخلاقِ عامّہ سے ان احکام و قوانین کا گہرا تعلق ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بہت سے احکام جو خاص ادوار و حالات میں بے حد مفید ہوتے ہیں، حالات کے بدل جانے کے بعد وہی احکام غیر مفید بلکہ اُلٹے نقصان دہ بن جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے فقہائے متاخّرین نے بہت سے مسائل میں اپنے مذہب کے ائمہ اور فقہائے متقدّمین کے خلاف فتوے دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اس اختلافِ فتویٰ کا اصل سبب ان کے دور کا اخلاقی انحطاط یا تمدنی انقلاب ہے۔ اس لئے اپنے پیشروؤں سے ان کا یہ اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ خود متقدّمین اگر ان کے زمانے میں ہوتے تو ان کا فتویٰ متاخرین کے فتویٰ کے مطابق ہوتا۔ اسی بنیاد پر فقہ کا یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا گیا ہے کہ:۔

لا ینکر تغیر الاحکام	زمانے کے حالات بدل جانے کے باعث
بتغیر الازمان۔	احکام میں تبدیلی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

لیکن اس متفق علیہ اصول کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ تمام فقہائے مذاہب اس بات پر بھی متفق ہیں کہ حالات اور زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے صرف ان ہی احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے جو اوّل تو اجتہاد سے تعلق رکھتے ہوں، ثانیاً ان میں بنائے اجتہاد محض مصلحت ملت ہو۔ ایسے اصولی احکام میں تغیر و تبدّل کا سوال پیدا نہیں ہوتا جو قرآن و سنّت کے واضح نصوص پر قائم ہیں۔ مثلاً محرّمات کی حرمت، لین دین کے معاملات میں فریقین کی رضامندی، اپنی

رضامندی سے کئے ہوئے معاہدات کا خود پابند ہونا، تاوان کی ادائگی کا ذمہ دار ہونا، اقرار کی ذمہ داری کا صرف اقرار کرنے والے تک محدود رہنا، ایذا رسانی کو روکنا اور جرائم کا قلع قمع کرنا، فساد کے ذرائع کو بند کرنا، حقوق کی حفاظت، ہر مکلف کا خود اپنے فعل اور اپنی غلطی کا ذمہ دار ہونا اور بے گناہ کو گناہ گار کی جگہ سزا دینے کی اجازت نہ دینا اور اسی طرح کے دوسرے اساسی امور جن کا قیام و بقا شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ یہی تو وہ بنیادی اصول ہیں جن کی تعلیم شریعت نے اس لئے دی ہے کہ اس کے ذریعے سے امتوں کے بگاڑ اور زمانے کے غلط رجحانات کا علاج کیا جاسکے۔ البتہ ان اصولوں کو زیر عمل لانے کے ذرائع و وسائل ہیں اور واقعات و حالات پر ان کی تطبیق میں، بدلے ہوئے حالات اور اختلاف زمانہ کا لحاظ کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر حق داروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے پہلے جو طریقہ اختیار کیا جاتا رہا ہے وہ یہ تھا کہ ایک ہی قاضی معاملات کا فیصلہ کرتا تھا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ اب اس طرز عمل میں موجودہ لحاظ سے یہ ترمیم کی جاسکتی ہے کہ مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک قاضی کے بجائے متعدد ججوں پر مشتمل ایک بنچ مقرر کی جائے

اور ایک ہی عدالت کا فیصلہ آخری نہ ہو بلکہ اپیل کی عدالتیں بھی قائم کی جائیں۔ اِس ترمیم کی وجہ اس دَور میں تقویٰ اور ایمانداری کی کمی ہے جس کے باعث ایک ہی قاضی کو آخری فیصلہ کر دینے کے اختیارات دے دینے میں اندیشہ ہے کہ انصاف کے تقاضے کما حقہٗ پورے نہ ہوں۔

اِس مثال سے یہ امر واضح ہے کہ شرعی قوانین میں حالات زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی تغیّر کیوں نہ ہو جائے، بہرحال صاحب حق کے حق کا استقرار، مصالح کا حصول اور مفاسد کا سدِّباب، وہ شرعی اساسات ہیں جن کا ہمیشہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ اور احکام کے تغیّر کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ شارع کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ذرائع اور وسائل میں تبدیلی کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے بالعموم ذرائع اور وسائل کو خود متعیّن نہیں کیا ہے۔ تاکہ ہر زمانے میں ہر مقاصد کے لیے بہتر سے بہتر اور کامیاب سے کامیاب تدابیر اختیار کرنے کی آزادی برقرار رہے۔

حالاتِ زمانہ میں تغیّر کی دو صورتیں

زمانے کے حالات میں جس تبدیلی کی وجہ سے شرعی احکام میں تغیّر کرنا پڑتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ یہ تغیّر لوگوں کے فسادِ اخلاق، تقویٰ کے فقدان اور ضعفِ ایمان کے

باعث ہو۔ اس قسم کے تغیر کو عام طور پر "فسادِ زمانہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

تغیر کی دوسری صورت یہ ہے کہ تمدن کی وجہ سے نئے نئے ادارے اور جدید قسم کی تنظیمات وجود میں آجائیں اور نئے قوانین، نئے قواعد و ضوابط اور جدید اقتصادی معاملات کے لئے نئے نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں۔ یہ دوسری قسم کا تغیر بھی پہلی قسم کی طرح ان اجتہادی احکام کے تغیر کا سبب بنتا ہے جو اس سے قبل کے حالات میں اختیار کئے گئے تھے اور جو موجودہ حالات کے مطابق نہیں ہیں، اس لئے کہ تبدیل شدہ حالات میں سابقہ اجتہادی احکام کا برقرار رکھنا یا تو بے نتیجہ ہوگا یا نقصان دہ اور ظاہر ہے کہ شریعت ان دونوں نقائص سے پاک ہے۔ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الموافقات" میں لکھا ہے کہ "شریعت بے مقصد احکام کا مجموعہ نہیں ہے"۔ اس قول کی مزید تشریح آگے آئے گی۔ ذیل میں دونوں قسم کے تغیرات کے باعث احکام میں تغیر کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ مثالیں بیشتر فقہائے احناف کے فتاویٰ سے ماخوذ ہیں۔

زمانے کے انحطاط کے باعث اجتہادی احکام میں تغیر کی چند مثالیں

بعض مسائل جن میں

فقہائے متأخرین نے اپنے مذہب کے ائمہ کے اجتہاد کے خلاف عمل کیا ہے اور اس اختلاف کا سبب انحطاطِ زمانہ کو قرار دیا ہے، یہ ہیں:۔

(ا) مذہبِ حنفی کا یہ طے شدہ اصول ہے کہ قرض کی ذمہ داری مقروض کی ذات پر عائد ہوتی ہے۔ اس کی املاک پر اس کے قرض کی براہِ راست ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ان کے نزدیک مقروض اپنی املاک اور اپنے اموال میں جو تصرف بھی کرے وہ شرعاً درست ہوگا، اگرچہ اس پر قرض اس کے مملوکات اور اموال کی مقدار سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر مقروض اپنا سارا مال وقف کر دے اور قرض کی ادائی کے لئے کچھ بھی باقی نہ رکھے تو بھی اس کا یہ وقف فقہائے حنفیہ کے نزدیک شرعاً جائز ہوگا، بشرطیکہ حکومت نے اس کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک نہ دیا ہو۔ یہ مذہبِ حنفی کا ایک قیاسی اصول تھا۔ لیکن جب لوگوں کی نیتوں میں فساد آ گیا اور دوسروں کے حقوق کی ادائگی کا احساس کم ہو گیا تو لوگوں نے قرض خواہوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے مال کو خود اپنی ذات پر یا اپنی اولاد پر اور سب سے آخر میں رفاہِ عام کے کسی کام پر وقف کرنا شروع کر دیا۔ جب متاخرین فقہائے حنفیہ نے یہ بات دیکھی تو سب سے پہلے مذہبِ حنفی کے اس اجتہاد کے خلاف مولیٰ ابو السعود[1] مفتیِ روم نے فتویٰ دیا کہ مقروض کا وقف صرف اسی

---

[1] ابو السعود کا پورا نام محمد ابن محمد العمادی ہے۔ ترکی کے ایک گاؤں اسکلیب کے باشندے تھے، اسی لئے مفتیِ روم (ترکی) کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ۹۸۲ھ میں وفات پائی۔ سلطان سلیم اور سلطان سلیمان کے زمانے میں فقہاءِ حنفیہ کے سرگروہ تھے۔ عثمانی سلطنت کے مفتیِ عام ہونے کے علاوہ قسطنطنیہ اور بروسہ کے قاضی تھے۔ پوری زندگی بڑی عظمت کے ساتھ گزاری۔ بعض مسائل میں اجتہاد بھی کیا ہے۔ ان کی بعض آرا کو ان کے زمانے نیز بعد کے علماء نے قبول کیا ہے۔ عربی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی تفسیرِ قرآن بھی مشہور ہے۔

قدر مال میں جائز تصور کیا جائے گا جو اُس پر عائد شدہ قرض سے زائد ہو یا اسی سلسلے میں انھوں نے سلطان کی جانب سے ایک حکم نامہ بھی جاری کرایا۔ ان کے زمانے اور بعد کے فقہا نے اس اجتہاد اور اس حکم کو تسلیم کیا۔

فقہائے حنفیہ نے قرض خواہوں کے حقوق کے تحفظ کا جو انتظام کیا ہے وہ "وقف" ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ مقروض اگر قرض خواہوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے وقف کے علاوہ دوسرے طریقے مثلاً بیع یا ہبہ وغیرہ اختیار کرنے لگیں جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے تو ان کے اس قسم کے تصرفات کو بھی ناجائز قرار دیا جائے گا اور اگر قرض خواہوں نے مقروض کو ان تصرفات کی خود ہی اجازت نہ دی ہو تو ان تصرفات کو باطل کر لینے کا ان کو اختیار حاصل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو علت وقف کو باطل کر دیتی ہے بعینہٖ وہی ان تصرفات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اُس دور کے فقہا نے صرف وقف ہی کے باطل ہونے کی صراحت اس وجہ سے کی ہے کہ ان کے زمانے میں قرض کی ادائگی سے بچنے کے لئے یہی طریقہ زیادہ تر رائج تھا۔ حنبلی فقہ کے لحاظ سے بھی ایسی حالت میں "وقف" نیز دیگر تصرفات کو ناجائز قرار دیا جائے گا، اگرچہ یہ جزئیہ مذہب حنبلی کے معروف اُصول کے خلاف ہوگا۔

۲۔ مذہب حنفی کا ایک اُصول یہ بھی ہے کہ مالِ مغصوب کی مدد سے حاصل کردہ نفع کی قیمت کی ادائگی غاصب کے ذمہ نہیں ہے۔ صرف اصل

کی واپسی اور اگر اصل برباد ہو گئی ہو یا خراب ہو گئی ہو تو اس کی قیمت کی ادائگی غاصب کے ذمہ ہوگی۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک نفع کی بذاتِ خود کوئی قیمت نہیں ہے۔ کرائے کی شکل میں نفع کی مقدار کا جو تعیّن کیا جاتا ہے وہ اُس معاہدے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کرایہ دار اور مالک کے درمیان طے پاتا ہے۔ غصب کی صورت میں اس قسم کا کوئی معاہدہ عمل میں نہیں آتا۔ اس لئے نفع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن متاخرین نے جب غصب کے معاملے میں لوگوں کی دلیری اور دینی احساس کی کمی دیکھی تو انھوں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ غصب کردہ مال اگر وقف کا یا کسی یتیم کا ہو یا کسی نفع آور کام کے لئے مخصوص کیا جا چکا ہو تو غاصب مدتِ غصب کے نفع کا تاوان ادا کرے گا۔ مذہبِ حنفی کے اصُول کے خلاف یہ فتویٰ لوگوں کو ظلم و زیادتی سے روکنے کے لئے دیا گیا۔ اس کا بنیادی سبب زمانے کا بگاڑ ہے۔ متاخرین کے زمانے میں اسی فتوے پر عمل درآمد کیا جانے لگا۔

اسی علّت پر قیاس کرتے ہوئے حنفی اجتہاد کے قواعد میں یہ اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ تین قسم کے اموالِ مغصوبہ کے علاوہ دُوسرے قسم کے اموال کے نفع کا تاوان بھی غاصب کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ اِس زمانے میں نیتوں کا فساد اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ آج کل دُوسروں کے مال

پر لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں اور حقوق ادا کرنے میں پہلو تہی عام ہو گئی ہے مزید برآں ہر قسم کے اموالِ مغصوبہ سے حاصل کردہ نفع کے تاوان کی ذمہ داری غاصب پر عائد کرنا آج کل کے قوانین کے مطابق بھی ہے اور مصالح کا اقتضا بھی یہی ہے۔

۳۔ مذہبِ حنفی کا ایک اور اصول یہ ہے کہ اگر بیوی کو مہرِ معجّل ادا کر دیا جائے تو شوہر اُسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے۔

لیکن جب اخلاقی انحطاط بڑھ گیا، ظلم و زیادتی کی کثرت ہو گئی اور لوگ اپنی بیویوں کو دُور دراز ملکوں میں جہاں بیوی کے اعزّہ میں سے کوئی نہیں ہوتا ہے لے جا کر ان کے حقوق غصب کرنے لگے اور ان پر ہر قسم کے مظالم توڑنے لگے تو متاخّرین نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیا کہ خواہ عورت کو مہرِ معجّل ادا کر دیا گیا ہو اس کو اپنے وطن سے یا جہاں پر عقد ہوا ہے وہاں سے دُور دراز کے ملکوں میں جانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فتویٰ بھی "فسادِ زمانہ" اور اخلاقی بگاڑ پر مبنی ہے اور اسی لئے یہی قول مفتی بہ قرار پایا اور قاضی اس کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔

۴۔ فقہ حنفی کا ایک اصول یہ ہے کہ قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر بھی مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ یعنی متنازعہ فیہ معاملات میں محض قاضی کا علم بھی، فیصلے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ مدعی کو

اثبات دعویٰ کے لئے شہادت کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ قاضی کا علم ہی شہادت کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے بعض فیصلے بھی اسی اصول کی نظیر کی حیثیت سے پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ دیکھا گیا کہ تقویٰ اور دیانت کے لحاظ سے اس پایہ کے قضاۃ باقی نہیں رہے کہ ان پر اتنی زمہ دست ذمہ داری ڈالی جاسکے بلکہ فساد نیت بڑھ گیا اور رشوت کی مثالیں بھی ملنے لگیں۔ علاوہ ازیں قاضیوں کے انتخاب اور تقرر میں دیانت، امانت اور صلاحیت کے بجائے حکام رسی چاپلوسی اور خوشامد معیار بن گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر متاخرین کا یہ فتویٰ ہوا کہ قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر مقدمات میں فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنا فیصلہ صرف ان مستند شہادتوں کی بنیاد پر کرے جو عدالت میں باقاعدہ پیش کی جاچکی ہوں حتیٰ کہ قاضی نے عدالت کے باہر اگر کسی معاہدے یا قرض کا معاملہ یا کسی اور واقعے کا مشاہدہ خود کیا ہو اور فریقین میں سے کوئی مدعی کی صورت میں اسی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرے اور فریق ثانی مدعی کے دعویٰ کا انکار کرے تو قاضی شہادت کے بغیر فیصلہ کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ اس فتویٰ کا سبب یہ ہے کہ قاضیوں کو فساد نیت کے باوجود اگر ان کے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ کسی ایک فریق کی پاسداری کرنے

سکیں اور جس کے حق میں جو چاہیں فیصلہ کر دیں۔ قاضیوں پر اس پابندی سے اگرچہ اس بات کا خطرہ ہے کہ بعض حق داروں کے حقوق شہادت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ان کو نہ مل سکیں لیکن دوسری طرف بہت سی غلط کارروائیوں کا انسداد اسی طریقے پر ممکن ہے کہ۔ چنانچہ اس امر پر باتفاق ہو گیا ہے کہ قاضی اگر اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرے گا تو اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا۔

البتہ تنازعی مقدمات کے علاوہ دیگر ایسے معاملات جو محض خیر کا پہلو رکھتے ہوں یا ان کی حیثیت انتظامی امور کی ہو یا ان کی نوعیت محض احتیاطی تدابیر کی ہو، ان میں قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر کوئی اقدام کر سکتا ہے۔ مثلاً قاضی کو اگر علم ہو جائے کہ زوجین کے درمیان شرعاً جدائی ہو چکی ہے لیکن عملاً دونوں کے تعلقات منقطع نہیں ہوئے تو اسے یہ اختیار ہے کہ وہ زوجین کے درمیان عارضی طور پر تفریق کرا دے۔ اسی طرح اسے اگر کسی مال کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ مال مغصوبہ ہے تو وہ اسے تا فیصلۂ عدالت کسی امین کے پاس جمع کرا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

۵۔ مذہب حنفی کے مبادیات میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ ایک کام اگر کسی شخص پر فرض ہو تو وہ اس فرض کی ادائگی پر نہ کوئی اجرت لے سکتا ہے اور نہ کسی سے ایسی اجرت کا معاملہ کر سکتا ہے۔ اسی اصل

سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ اگر غاصب غصب شدہ مال کو غصب کے مقام تک واپس لانے کی اُجرت طلب کرے اور اصل مالک اُجرت دے دے تو غاصب کے لئے وہ اُجرت جائز نہ ہوگی اور قاضی اُجرت کو واپس دلائے گا۔ اسی طرح اگر بیوی گھر کے فرائضِ واجبہ کی ادائگی سے انکار کر دے اور شوہر اُس کے بدلے میں اسے تنخواہ یا اُجرت دے تو یہ لین دین کا معاملہ درست نہ ہوگا اور بیوی کو اُجرت لینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اسی اصول سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ امامت، خطبۂ جمعہ، تعلیمِ قرآن اور اس قسم کے فرائضِ دینی کی بجا آوری پر اُجرت لینا جائز نہیں جو ان کی انجام دہی پر قادر ہو اُسے بلا معاوضہ یہ خدمت انجام دینی چاہیئے کیونکہ یہ اُس کے ذمے ایک دینی و شرعی فریضہ ہے۔

لیکن متاخرین نے دیکھا کہ ان فرائض کی ادائگی میں لوگ بے حد سہل انگاری سے کام لینے لگے ہیں، بیت المال سے علما کے وظائف بند ہوگئے ہیں اور وہ کسبِ معاش کی طرف اپنی توجہات منعطف کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں حتیٰ کہ صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ اگر ان فرائض کی ادائگی کے لئے اُجرت قبول کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو سرے سے ان فرائض کی بجاآوری ہی موقوف ہو جائے گی۔ اس صورتِ حال پر نگاہ رکھتے ہوئے فقہا نے اس قسم کے فرائض پر اُجرت لینے کی اجازت دے

دی تاکہ تعلیمِ قرآن، علم کی نشر و اشاعت اور شعائرِ دینی کی حفاظت کا سلسلہ جاری رہ سکے۔

۶۔ فقہا کے ہاں یہ اصول بھی مسلّم ہے کہ قانونِ شہادت کی رُو سے گواہوں کا عادل ہونا ضروری ہے اور عادل ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ شاہد فرائض کا پابند اور صدق و امانت میں مشہور ہو۔ گواہوں کے لئے مذکورہ شرائط قرآن و سنّت کی تصریحات اور فقہا کے اجماع سے ثابت ہیں۔ لیکن فقہائے متاخرین نے یہ محسوس کیا کہ شریعت نے جس قسم کی عدالت کا مطالبہ کیا ہے وہ آج کل بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانہ بگڑ چکا ہے اور نیتوں میں فساد پیدا ہو گیا ہے اور دینی احساس میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ اس لئے قاضی اگر اس دور میں بھی کامل العدالت گواہوں کا مطالبہ کریں تو بہت سے حقدار اپنے حقوق سے محض اس وجہ سے محروم رہ جائیں گے کہ مطلوبہ شہادت فراہم کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کو مدّنظر رکھتے ہوئے فقہا نے "الامثل فالامثل" کا اصول اختیار کر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ موجود ہوں ان میں سے جو بہتر سے بہتر ہو اس کی شہادت پر فیصلہ کرنا جائز ہو گا اگرچہ وہ شہادت فی نفسہا شریعت کے معیارِ کامل کے مطابق نہ ہو۔ گویا کہ بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے فقہا نے "مطلق عادل" کی شرط کے

بجائے "مقابلۃً عادل" ہونے کی شرط کو قبول کر لیا اور اس طرح سے ایک اُصول میں اضافی اور جزوی ترمیم کر کے ایک بڑے اور اہم تر اُصولِ شریعت کو پامالی سے بچا لیا۔

۷۔ اسی طرح فقہاء متاخرین نے رمضان اور عیدین کے چاند کے لئے مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو افراد کی شہادتوں کو کافی قرار دیا ہے۔ حالانکہ قدیم مذہب حنفی یہ ہے کہ اگر مطلع گرد و غبار، ابر و باد اور کہر وغیرہ سے پاک ہو تو رویتِ ہلال کے لئے دو آدمیوں کی شہادت کافی نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بہت بڑی تعداد کا چاند دیکھنا ضروری ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بکثرت لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، اس لئے مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو آدمیوں کا چاند دیکھنا بعید از قیاس ہے اور ان کی شہادت میں غلطی اور شبہ کا امکان ہے۔ اس کے برعکس متاخرین نے دو آدمیوں کی شہادت قبول کر لینے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہت کم لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس لئے صرف دو آدمیوں کی شہادت کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا، بشرطیکہ وہ شاہد عادل ہوں اور ان کی گواہی شک و شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ ان بہت سے مسائل میں سے چند مسائل ہیں جن میں فقہا کے فتوے اور قاضیوں کے فیصلے تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ تغیر نقطۂ نظر یا اصول

فقہ میں کسی تبدیلی کی وجہ سے واقع نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کا سبب محض زمانے کا انحطاط، عام فسادِ اخلاق، ادائے فرض میں کوتاہی اور دیانت و حق شناسی کا عمومی فقدان ہے۔

تمدن کی ترقی اور ذرائع و وسائل میں تبدیلی کے باعث احکام میں تغیر کی مثالیں،

زمانے کے اخلاقی انحطاط کے علاوہ دوسری اہم شے جو احکامِ اجتہاد پر اثر انداز ہوتی ہے وہ معاشرتی و تمدنی حالات کی تبدیلی اور معاشی و اقتصادی وسائل کا ارتقا ہے۔ اس کی مثالیں درجِ ذیل ہیں:-

۱۔ جب تک زمینوں کی پیمائش اور ان کے نمبروں وغیرہ کا تعین نہیں ہوا تھا اس وقت تک یہ طریقہ رائج تھا کہ قابلِ فروخت جائداد اگر سامنے موجود نہیں ہوتی تھی تو بیع کی صحت کے لئے زمین کے حدودِ اربعہ کی وضاحت ضروری ہوتی تھی، تاکہ وہ ملحقہ اراضی سے ممیز ہو جائے اور اس طرح سے مبیع کے معلوم ہونے کی شرط پوری ہو جائے۔ لیکن آج کل چونکہ اکثر ملکوں میں زمین کی پیمائش ہو چکی ہے، ریکارڈ کے باقاعدہ دفاتر قائم ہو چکے ہیں اور قطعاتِ اراضی کی پیمائش کے بعد ان کے نمبرات کا تعین کیا جا چکا ہے، اس لئے اب کسی جائداد کو فروخت کرتے وقت صرف اس کے

نمبر کا ذکر کر دینا کافی ہوگا اور حدود اربعہ کی وضاحت کی ضرورت نہ ہوگی جائدادوں کی بیع و شرا کے وقت آج کل محض ریکارڈ کے نمبروں کا ذکر کر دینا عین حکمتِ تشریع کے مطابق ہوگا۔ کیونکہ زمانے کے ترقی یافتہ ذرائع نے باقیات کا ایک ایسا طریقہ دریافت کر لیا ہے جو تعیین کے اعتبار سے حدودِ اربعہ کے مقابلہ میں سہل تر اور صحیح تر ہے۔ اگر حدودِ اربعہ کی وضاحت کو اب بھی بیع کی شرط لازم قرار دیا جائے تو یہ ایک فعل عبث ہوگا اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے شریعت میں فضول اور بیکار باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح فروخت کردہ جائداد پر مشتری کو قبضہ دینے کے سلسلے میں پہلے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ بائع جائداد کا باقاعدہ قبضہ مشتری کو دلا دے یا چابی وغیرہ اس کے حوالے کر دے۔ اگر بائع اس طرح مشتری کو قبضہ نہ دلائے تو جائداد بائع ہی کے قبضے میں سمجھی جائے گی اور اگر اس دوران میں جائداد تباہ ہو جائے یا اسے کچھ نقصان پہنچے تو اس کا ذمہ دار بائع ہوگا، جیسا کہ قبضہ کے بغیر بیع کی صورت میں عام فقہی قوانین کا تقاضا ہے۔ لیکن جب غیر منقولہ املاک کی رجسٹریشن کا قانون بن گیا تو قبضہ دلانے کے لئے یہ بات کافی ہو گئی کہ بیعنامہ کو رجسٹری کرا لیا جائے۔ چنانچہ قاضی اسی اصول پر فیصلے کرنے لگے کہ تاریخ رجسٹری کے بعد فروخت شدہ جائداد کی تباہی کی ذمہ داری بائع کے بجائے مشتری کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ رجسٹری

کے ذریعہ قبضہ دلانا عملی قبضہ دِلانے سے زیادہ موثر ہے۔ غیرمنقولہ جائداد میں اصل اعتبار اُس شخص کا ہے جس کا نام بحیثیتِ مالک درج ہو نہ کہ ان ہاتھوں کا جو اس جائداد کا انتظام کر رہے ہوں۔ جب بائع نے ایک بار اپنی جائداد کو فروخت کر کے رجسٹری کرادی تو وہ اب کسی اور شخص کے ہاتھ وہی جائداد فروخت نہیں کر سکتا کیونکہ دفتر رجسٹرار میں اس کا نام بحیثیت مالک درج ہی نہیں ہے۔ اسی طرح حقِ بیع کے علاوہ باقی تمام حقوقِ ملکیت بھی مشتری کو رجسٹریشن کے بعد حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ جائداد کے منتظمین اور متصرفین کو تبدیل کرنے کا بھی مجاز ہو جاتا ہے۔ ان دلائل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دفتری نظم و نسق میں ترقی کے باعث یہ چیز رُوحِ شریعت کے بالکل مطابق ہے کہ بیعنامہ کی رجسٹری عملی قبضہ دلانے کے قائم مقام قرار دی جائے۔

یہ اور اس طرح کی دُوسری مثالوں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تغیّرِ زمانہ سے تغیّرِ احکام کے اصول کو محض "عرفِ عام" کے نظریّہ پر محمول کرنا درست نہیں ہے جیسا کہ بعض محقّقین نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ قاعدہ دراصل "مصالحِ مرسلہ"[1] کے اصول سے ماخوذ ہے۔ اس کی دلیل

---

[1] "مصالحِ مرسلہ" ایک فقہی اصطلاح ہے جس کے تحت تشریع اور قانون سازی کا وہ حصّہ آتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے عمومی مفاد و مصلحت کا لحاظ رکھ کر سرانجام دیا جاتا ہے۔

یہ ہے کہ فرائض کی ادائگی میں پہلو تہی، نیتوں کا فساد، تقوٰی کا فقدان، طمع کی کثرت، اختراعاتِ جدیدہ اور تمدن کی ترقی وغیرہ امور "عرفِ عام" کی قسم کی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کی بنیاد پہ لوگ عام طور سے آپس میں معاملہ کرتے ہوں، بلکہ درحاصل ان میں سے بعض اخلاقی زوال کا نتیجہ ہیں اور بعض تمدن کی ترقی کا تقاضا ہیں اور یہ دونوں امور ان اجتہادی احکام کو جو مخصوص حالات کے لئے وضع کئے گئے تھے، بدلے ہوئے حالات میں ناقابلِ عمل بنا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے شریعت کے مقاصدِ اولیہ فوت ہونے لگتے ہیں اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان اجتہادی احکام کو تبدیل کر کے انھیں ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے تاکہ شریعت کے اصل مقاصد پورے ہو سکیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر بادبانی کشتی کو کسی خاص سمت میں لے جانا ہو تو اس کے بادبان کا رُخ اُس خاص سمت پہ اس طرح رکھا جائے گا کہ کشتی مطلوبہ سمت میں حرکت کر سکے لیکن جب ہوا کا رُخ بدل جائے تو بادبان کے رُخ کو بھی اُسی طرف بدلنا پڑے گا تاکہ کشتی مطلوبہ سمت میں سفر کرتی رہے ورنہ یا تو کشتی کا رُخ منزلِ مقصود کی طرف سے پھر جائے گا یا کشتی ایک ہی جگہ کھڑی ہو جائیگی اور یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصود کشتی کو ایک مقامِ مطلوب تک پہنچانا ہے نہ کہ بادبان کا کسی خاص رُخ پہ رکھنا۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "نشر العرف" میں لکھا

ہے کہ " بہت سے احکام زمانے کے اختلاف کے باعث بدل جانے ہیں ان میں سے بعض میں تبدیلی " عرف " کے بدل جانے کے سبب سے ہوتی ہے، بعض میں کسی نئی ضرورت کے پیش آجانے کے سبب سے ہوتی ہے اور بعض میں تبدیلی کا سبب زمانے کا فساد ہوتا ہے۔ مذکورہ اسباب کی وجہ سے احکام میں تبدیلی اس لئے ہوتی ہے کہ اگر احکام کو علی حالہٖ باقی رکھا جائے تو اس کی وجہ سے لوگوں کو بڑی مشقت اور نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ چیز شریعت کے اصول " تیسیر و تخفیف " اور " دفع ضرر و فساد " کے خلاف ہوگی۔ اسی لئے فقہا نے بہت سے مواقع پر اپنے مذہب کے امام کی تصریحات سے اختلاف کیا ہے کیونکہ امام کی رائے ان معاملات میں اپنے زمانے کے حالات کے مطابق تھی اور خود امام کے مقرر کردہ اصولِ فقہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر امام اس بدلے ہوئے زمانہ میں ہوتے تو ان کا فتویٰ بھی وہی ہوتا جو موجودہ دور کے فقہا کا ہے"۔ امام شہاب القرافی نے بھی اپنی کتاب " الفروق " میں فرق ۲۸ کے تحت لکھا ہے کہ " منقولات پر ہر حال میں جمے رہنا دینی گمراہی کی ایک قسم ہے اور یہ علما اور سلفِ صالحین کے پیشِ نظر مقاصد سے ناواقفیت اور جہالت کا کھلا ہوا ثبوت ہے "۔

علامہ ابن القیم علیہ الرحمۃ نے " اعلام الموقعین " ج ۳ ص ۱ پر " زمان

مکان، احوال و عادات اور نیّات میں تبدیلی کے باعث فتوٰی میں تبدیلی" کے عنوان کے تحت لکھا ہے: "فتوٰی میں تبدیلی کا یہ بڑا اہم اصول ہے۔ جو لوگ اس کی حقیقت کو نہیں جانتے وہ شریعت کے بارے میں زبردست غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، جن کی وجہ سے لوگوں کو ناقابلِ برداشت تنگی، مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت جس نے مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اس قسم کی تنگی کو پسند نہیں کر سکتی، کیونکہ شریعت کی بنیاد حکمت اور عوام الناس کے دینی اور دُنیوی مصالح پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ شریعت تو مجسّم عدل و انصاف، یکسر رحم و ہمدردی اور سراسر مصلحت ہے۔ اس لئے ہر وہ مسئلہ جو انصاف کے بجائے ظلم و زیادتی کا، رحم کے بجائے سختی و نامہربانی کا اور مصلحت و حکمت کے بجائے مفاسد و لغویات کا سبب بن جائے وہ ہرگز شریعت کا مسئلہ نہیں ہو سکتا خواہ تاویل کر کے اُسے نظامِ شریعت میں زبردستی ٹھونس دیا جائے"۔

مذہب اور قانون کا باہمی رشتہ

(سر الفریڈ ڈیننگ)

[یہ مضمون سر الفریڈ ڈیننگ (Sir Alfred Denning) کی ایک تازہ ترین کتاب "بدلتا ہوا قانون" (Changing Law.) کے آخری باب کا ترجمہ ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مصنف مملکتِ برطانیہ کی کورٹ آف اپیل کے ایک جج ہیں۔ یہ مضمون ہمارے تعلیم یافتہ طبقے خصوصاً ہمارے قانون ساز اور قانون دان حضرات کے لئے قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے مذہبی مبلغین اور اخلاقی مصلحین و مفکرین ہی نہیں، بلکہ وہاں کے بعض مقننین بھی اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کر رہے ہیں کہ مذہب کو بنیاد بنائے بغیر کوئی

دستوری، قانونی یا اجتماعی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ اس مضمون سے اِس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کے پاس جس صورت میں بھی اور جو کچھ بھی بچا کھچا اثاثہ مسیحیت کی تعلیمات کا موجود ہے، وہاں کے قانون دان کس طرح اسے اپنے سینوں سے چمٹا کر قانون سازی کے کام میں اس کو مشعلِ راہ بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایک طرف یورپ کے یہ قانون داں ہیں جو بڑی تشویش کے ساتھ اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی حیاتِ اجتماعی سے اگر مذہب کی کارفرمائی غائب ہو گئی اور قوانین کی مذہبی بنیادوں کو منہدم کر دیا گیا تو کوئی قانونی نظام بھی کامیابی سے نہیں چل سکے گا۔ دوسری طرف ہمارے قانون ساز ہیں جنھیں ہر ایسی تجویز پر پریشانی اور ناگواری محسوس ہونے لگتی ہے جس میں اسلام کو دستور اور قانون کا ماخذ اور بنیاد قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہو]۔

عہدِ قدیم میں مذہب اور قانون کا تعلق بہت ہی گہرا تھا، مگر جدید زمانے میں مذہب کا قانون پر کوئی نمایاں اثر باقی نہیں رہا ہے۔ گزشتہ ادوار میں مذہب، اخلاق اور قانون اجزائے لاینفک کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً تورات کے احکامِ عشرہ میں سے پہلا حکم "مذہبی" نوعیت رکھتا ہے اس کے الفاظ ہیں: "خدا نے فرمایا کہ مَیں خداوند تیرا خدا ہوں، تیرا کوئی اِلٰہ نہیں ہے سوائے میرے"۔ پانچواں حکم اخلاقی نوعیت کا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اپنے والدین کی عزت کر تاکہ تیرا قیام اُس زمین میں دراز ہو جو تجھے خدا عطا کرے"۔ آٹھواں حکم ایک قانونی فریضہ ہے اور اس کی عبارت یہ ہے: "تو ہرگز چوری نہ کر"۔ قدیم مذاہب و اقوام سب میں یہی صورت حال تھی لیکن بعد میں آہستہ آہستہ مذہب، اخلاق اور قانون، تینوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ اِس تفریق و امتیاز کو اب بہت دور تک پہنچا دیا گیا ہے حتّٰی کہ بہت سے لوگوں میں اب یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب اور قانون کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کا مقولہ یہ ہے کہ "مذہب خدا اور انسان کے تعلقات متعین کرتا ہے اور قانون ایک انسان اور دوسرے انسان کے تعلقات کا تعیّن کرتا ہے"۔ اِسی طرح ان لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ قانون کا اخلاق سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ قانون بہرحال واجب الاتباع ہے خواہ وہ اخلاقی لحاظ سے صحیح ہو یا غلط۔ قانون کا مقصد معاشرے میں نظم و ضبط کو برقرار رکھنا ہے نہ کہ عدل و انصاف کو قائم کرنا۔

میری دانست میں تفریق و انقطاع کا یہ تصوّر حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اگرچہ مذہب اور قانون کو ایک دوسرے سے جُدا کیا جا سکتا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں بڑی حد تک ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ مذہب کے بغیر اخلاق کا وجود ناممکن ہے اور اخلاق کے بغیر قانون کا وجود محال ہے۔ آئیے میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کروں کہ ہمارے قانون کے بنیادی

اصول کس طرح عیسائیت کی تعلیمات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

صداقت سب سے پہلے ہم حق و صداقت کے اصول کو لیتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ سچ بولنا ہر آدمی کا بنیادی فریضہ ہے۔ اب اگر مذہب، اخلاق اور قانون کے تقاضوں سے قطعِ نظر کر کے محض مصلحتِ وقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حق پرستی کے خلاف بھی اتنے ہی دلائل دیئے جا سکتے ہیں، جتنے اس کے حق میں دیئے جا سکتے ہیں۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ "دیانت و صداقت بہترین پالیسی ہے"۔ لیکن ایک مصلحت بین انسان کی نگاہ میں اس ضرب المثل پر کاربند ہونا دانشمندانہ نہیں، بلکہ سراسر ایک احمقانہ فعل قرار پائے گا۔ اگر جھوٹ بولنے سے اس کا مقصد حاصل ہوگا تو وہ ضرور جھوٹ بولے گا اور دلیل یہ دے گا کہ اصل اعتبار مقصد کا ہے نہ کہ ذریعے کا۔ مثلاً ایک مصلحت پرست انسان کے خلاف اگر یہ الزام عائد کیا جائے کہ وہ نشے کی حالت میں کار چلا رہا تھا تو وہ بڑی آسانی سے انکار کر دے گا خواہ یہ الزام صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جھوٹ سے ہمیں صرف اس لئے نفرت ہے کہ ہمیں اپنے والدین نے اس وقت سچ بولنے کی تعلیم دی تھی جبکہ اُن کی آغوشِ عاطفت میں ہمارے اندر بھلے اور بُرے کی تمیز پیدا ہو رہی تھی۔ ہمیں دینِ مسیحیت نے یہ سکھایا ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حال میں

سچ بولیں۔ سینٹ پال نے فرمایا تھا "جھوٹ کو ترک کر کے ہر آدمی اپنے ہمسائے کے سامنے سچ بولے۔ کیونکہ ہم ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔"
ہمارے اندر غصے اور ناراضگی کے جذبات سب سے زیادہ اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے ——— ہمارے سامنے دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ اِس سے بڑھ کر ہماری شخصیت کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ دُوسرا آدمی ہمیں دھوکا دے اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم کسی دُوسرے کو دھوکا دیں۔

مقدس فریب

بعض مذہبی خیال رکھنے والے لوگ خاص حالات میں نیک مقصد کے لیے جھوٹ بول لینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ ایک زمانے میں اسے جائز قرار دیتا تھا مثلاً حضرت مسیحؑ اور دُوسرے صلحا کی زندگیوں کے بارے میں افسانے گھڑ کر انھیں حقیقی واقعات کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اِس سے مقصود ایمان و اعتقاد کو پختہ کرنا تھا۔ تاہم اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک فریب تھا۔ اِسی کے نتیجے میں "مقدس فریب" کی اصطلاح وضع کی گئی جو اب ہماری زبان میں عام رائج ہو چکی ہے۔ (P.ous Fraud.) موجودہ زمانے میں اس کی ایک مثال وُہ دروغِ مصلحت آمیز"

سے ہے جس کا ارتکاب ایک معالج اپنے مریض کے سامنے کرتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک یہ فعل مریض کے حق میں نفع بخش ہوتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ "ہمسائے سے سچ بولنے کا حکم قطعی اور مطلق ہے" سینٹ آگسٹائن کے نزدیک حق گوئی ایک قطعی فریضہ ہے جس میں کسی استثنا کی گنجائش نہیں ہے۔ انھوں نے اس کے حق میں صرف اس دلیل کو کافی سمجھا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کو عالمِ آخرت میں حیاتِ طیب نصیب نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور میں کانٹ اور بعض دیگر مفکرین کا بھی یہی خیال ہے کہ ہر حالت میں سچ بولنا قطعی ضروری ہے۔" آپ یہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ حالتِ جنگ میں کیا دشمن کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹ بولا جا سکتا ہے؟ لیکن ایک سچا عیسائی اس کا بجا طور پر یہ جواب دے سکتا ہے کہ جو دشمن ہمیں تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے اُس پر ہمسایہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس سے سچ کہنا ضروری ہے۔

قانون اور صداقت

اب آپ قانون کو لیجیے۔ قانون کی نگاہ میں بھی سچ بولنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک خالص سچائی منظرِ عام پر نہ آئے، قانون اور عدل کے تقاضے کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ قانون اور عدل کی محافظت اور تنفیذ کا بہت بڑا ذریعہ ہمارا عدالتی نظام ہے لیکن اگر فریقین اور گواہ

عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ اس سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حق پرستی جس کا اصل سرچشمہ مذہبی تعلیم ہے، قانون کے بقا کے لئے کس قدر ضروری ہے اور مذہب و قانون کا باہمی تعلق کتنا گہرا اور بنیادی ہے۔ یہاں میں جملۂ معترضہ کے طور پر اتنی بات ضرور کہوں گا کہ میرا یہ استدلال ایک مفروضے پر مبنی ہے اور یہ استدلال اُسی صورت میں صحیح ہوگا جبکہ قانون بذاتِ خود عادلانہ ہو اور عدالتوں میں بیٹھنے والے جج خود بھی حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ اگر قانون ظالمانہ ہوگا یا عدلیہ کے علمبردار اس کے نفاذ و اجرا میں انصاف پسندی سے کام نہیں لیں گے تو عدالتوں میں پیش ہونے والے گواہوں کے اندر لازماً یہ رجحان پیدا ہوگا کہ وہ مقدس فریب سے کام لے کر دروغ بیانی کریں۔ ہمارے ہاں ایک زمانہ وہ تھا کہ چالیس شلنگ قیمت کی چوری کی سزا موت تھی۔ اس کا نتیجہ ایک مرتبہ یہ نکلا تھا کہ پانچ پونڈ کے ایک مسروقہ نوٹ کے بارے میں جیوری نے پوری سنجیدگی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس نوٹ کی قدر و قیمت انتالیس شلنگ سے ہرگز زائد نہیں ہے اور اس اعلان کو کسی نے بھی قابلِ مذمت نہیں سمجھا تھا۔ بہرحال قانون کا صرف واضح اور متعین ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کی کامرانی کے لئے اس کا مبنی برانصاف

ہونا بھی ضروری ہے۔

حلف کی اہمیت سچائی کے لازمۂ قانون و انصاف ہونے اور اُس کی ضرورت مسلم ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دُنیا بھر کی عدالتیں سچ بولنے پر اصرار کرتی ہیں اور ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم اُٹھائے۔ قانون کے نقطۂ نظر سے مذہبی تصوّرات و اعتقادات کی اہمیت کی اس سے زیادہ واضح مثال ہمارے قانونی نظام میں مشکل سے ملے گی۔ گویا ہمارے قانون کا بنیادی مفروضہ اور نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ہر شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور وہ خدا اور ایمان کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولے گا۔ عدالتوں کے قیام پر صدیاں گزر چکی ہیں لیکن آج بھی جو شخص گواہ کے کٹہرے کے سامنے آتا ہے اُسے سب سے پہلے حلف اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس فعل کے تقدس کے پیشِ نظر عدالت میں ایک خاموش فضا پیدا کی جاتی ہے۔ گواہ اپنے ہاتھ میں مقدس کتاب لیتا ہے اور یہ الفاظ کہتا ہے "میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچی گواہی دوں گا میں سچائی، مکمل سچائی پیش کروں گا اور سچائی کے سوا کچھ پیش نہیں کروں گا"۔ گواہ کے ہاتھ میں جو مقدس کتاب دی جاتی ہے وہ انجیل (عہد جدید) ہوتی ہے، اِلّا یہ کہ گواہ کسی دوسری کتاب کا مطالعہ کرے۔ جس وقت گواہ یہ قسم اٹھاتا ہے تو وہ صرف جج ہی کو یہ باور نہیں کرا رہا ہوتا کہ وہ سچ بول رہا ہے بلکہ وہ اپنے

خدا کے سامنے یہ پختہ عہد باندھ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔" مقدس فریب" اور "جزوی صداقت" (Half Truth) خدا کے ہاں کسی کام کی نہیں ہے۔ ایک عامی سے عامی اور جاہل سے جاہل آدمی بھی جب کٹہرے میں آتا ہے تو اسے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے۔ ویسٹرن سرکٹ کی ایک عدالت میں اس واقعہ کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے کہ ایک گواہ نے قسم سے پہلے معمول کے مطابق کلمات دہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا" کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کر لے"۔ چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جگہ پر اس وقت ایک پتھر نصب کر دیا گیا تھا جو اب تک اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اگر گواہ کسی ایسے مذہب یا عقیدے کا پیرو ہو جس کے لحاظ سے قسم کی کوئی دوسری شکل مناسب ہو تو عدالت میں اسی کو اختیار کیا جاتا ہے۔ گواہ کو بہرحال ایسی قسم اٹھانی پڑتی ہے جو اسے اپنے ضمیر و اخلاق کے مطابق سچ بولنے کے لئے پابند کر دیتی ہو۔

اس بحث سے آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ قانون کا منشا اور تقاضا صرف اتنا ہے کہ محض عدالت میں قسم کھا کر سچ بولنا ضروری ہے اور دوسرے مواقع پر جھوٹ بولنے میں ہرج نہیں ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں!! ہر انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جب بھی کسی دوسرے انسان سے کوئی معاملہ کرے اس میں حق و صداقت کی روش پر کاربند رہے۔ قانون جتنا اس معاملے میں

سخت گیر اور متشدد ہے، اتنا کسی دوسرے میں نہیں ہے۔ وہ کسی لیپ ویلپش اور ہیرا پھیری (Evasion) کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ایک بیان محض الفاظ کی حد تک صحیح ہو لیکن اس میں سے کسی ایسے حصے کو قصداً حذف کر دیا گیا ہو جس کی وجہ سے غلط تاثر پیدا ہوتا ہو تو ایسا بیان ایک "فریب" ہے جیسا کہ لارڈ کلسینٹ (Kylsant.) کو ایک تیز خسارہ اٹھانے کے بعد اس تلخ حقیقت کا علم ہوا تھا انھوں نے کیا یہ تھا کہ ایک کمپنی کے منافع جات کے اعداد و شمار تو انھوں نے شائع کر دیئے مگر نقصانات کے اعداد شائع نہیں کئے۔ اس سے کمپنی کی مالی حیثیت کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ لارڈ موصوف کو اس کے نتیجے میں ایک سال جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ غلط بیانی اور فریب دہی وغیرہ کے بارے میں ہمارے ہاں جتنے بھی قوانین نافذ ہیں ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ "کسی آدمی کو کذب بیانی سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے گی بشرطیکہ قانون میں کچھ بھی گنجائش ہو۔ کسی عذر یا تاویل کو قبول نہیں کیا جائے گا کسی نیک مقصد کے لئے بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ پاکیزہ مقصد کے لئے ذریعہ بھی پاکیزہ ہونا چاہیئے"۔ اس معاملے میں ہمارا قانون تو بلاشبہ بہت مضبوط اور معقول ہے مگر میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قانون تنہا کافی نہیں ہے اگر لوگوں کے اندر مذہب کی سچی روح مفقود ہو تو محض قانونی دفعات بالکل بے کار اور لاطائل ہیں۔ کیا دیانت و امانت کے آج کل ناپید ہونے کی اصل وجہ الحاد و بے دینی نہیں

ہے؟ بیشتر گواہ جو ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں وہ حلف کی تقدیس کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایسا بیان دیتے ہیں جو اُن کے خیال میں اُن کے مقدمے کے لئے مفید ہو، خواہ وہ سچ ہو یا جھوٹ ہو۔

ایفائے عہد | وعدے کا پورا کرنا بھی سچ بولنے سے کچھ کم اہم نہیں ہے زبور کے الفاظ میں "کھرا آدمی صرف وہی نہیں ہے جو زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے بلکہ وہ ہے جو ہمسائے سے وعدہ کر کے اُسے مایوس نہ کرے خواہ اُسے خود تکلیف کا سامنا کرنا پڑے"۔ اس اصول کو ہمارے قانون میں بڑا دخل ہے۔ ہمارا قانونِ معاہدات مختلف مراحل میں سے گزرتا رہا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ صرف قانونی دستاویز پر لکھا ہوا اور مہر زدہ معاہدہ قابلِ وثوق سمجھا جاتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ صرف وہ معاہدہ لازم قرار دیا جاتا تھا جس کے عوض میں کچھ مالی لین دین عمل میں لایا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں ان تکلفات و رسوم کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ آج کل اگر ایک انسان ایسا وعدہ کرتا ہے جس کی پابندی لازمی قرار دی جائے اور جس کی بنا پر دوسرا فریق کوئی کاروائی کرتا ہے تو اب اس کاروائی کے وقوع میں آجانے کے بعد اُس وعدے کی پابندی ازروئے قانون واجب ہو جاتی ہے۔

مطبوعہ معاہدات | معاہدات کی حفاظت کے لئے ہمارے قانون کا مستعد ہونا بڑی خوش آئند بات ہے۔ لیکن بعض حالات میں یہ قانونیت حد سے

تجاوز کر جاتی ہے۔ اس تجاوز کی سب سے واضح مثال ہمارے قانون کا وہ رویہ ہے جو اس نے مطبوعہ اور لگے بندھے معاہدات (Standardised Contracts.) کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ انشورنس کمپنیاں، بنک اور دوسرے تجارتی اور صنعتی ادارے معاہدے کے چھپے چھپائے فارم تیار رکھتے ہیں جن میں بے شمار شرائط درج ہوتی ہیں۔ ایک عام آدمی کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ یا تو ان سیاسی شرائط پر دستخط کرے یا پھر ان اداروں سے کوئی معاملہ ہی نہ کرے۔ ہاں پر دستخط کرنے کے بعد ایک شخص ان شرائط کے ساتھ ایسا بندھ جاتا ہے گویا کہ اس نے ان میں سے ایک ایک شرط کو عمداً پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ہے۔ پھر جب ان شرائط کی تعبیر و تشریح کا مرحلہ آتا ہے تو معاہدے کی لفظی پابندی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اگر معاہدہ کرنے والا احتجاج کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "مجھے ایسی نادیدہ صورت حال کا پیشگی کچھ بھی علم و تصور نہ تھا" تو اسے جواب دیا جاتا ہے کہ "یہ تمہارا اپنا قصور ہے تمہیں ہوشیار اور خبردار رہنا چاہئے تھا"۔ لیکن میرے خیال میں یہ قانونی روش صحیح نہیں ہے اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اگر سینٹ طامس ایکوی ناس (ST Thomas Acquinas.) ہوتے تو وہ یقیناً دستخط کرنے والے کو معذور قرار دیتے۔ فریقین میں سے ہر ایک کے اندر حسن نیت (Good Faith.) کی موجودگی ضروری ہے۔ کسی ایک فریق کو اس کا موقع نہیں دیا جانا چاہئے کہ وہ بال کی کھال نکال کر الفاظ میں سے ایسا مفہوم برآمد

کرے جو دوسرے فریق کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہو۔ قوانینِ ملکی کی تعبیر میں بھی ایسی دقتیں پیش آتی ہیں۔ بعض حالات میں منصفانہ قوانین کے الفاظ کو بھی ایسے معنی پہنا لئے جاتے ہیں جو قانون سازوں کے منشا کے بالکل خلاف ہوتے ہیں اور جن سے انصاف کے تقاضے بری طرح پامال ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون بڑا غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور جج یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ

"پارلیمنٹ کے پاس کردہ قوانین کے رخنوں کو پُر کرنا ہمارا کام نہیں ہے"۔

لفظی موشگافیاں

میرا خیال یہ ہے کہ معاہدات اور قوانین کی تشریح میں اس قسم کی موشگافیاں سچائی کے بنیادی اور حقیقی تصور کے قطعاً منافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان الفاظ پر حاکم ہونے کے بجائے ان کا محکوم بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر آپ انجیل پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ محض الفاظ کی غلامی کی کتنی مذمت کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی نمایاں مثال وہ واقعہ ہے جو یوم سبت سے متعلق ہے۔ تورات کا چوتھا حکم یہ ہے کہ "سبت کے دن تو کوئی کام نہ کر"۔ ایک دفعہ حضرت مسیحؑ کے حواری گندم کے کھیت میں سے گزر رہے تھے اور ہفتے (سبت) کا دن تھا۔ انھوں نے خوشے توڑنے شروع کر دیئے۔ فریسیوں نے کہا کہ "سبت کے دن یہ لوگ فعلِ حرام کا ارتکاب کیوں کر رہے ہیں"۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا "سبت انسان کے لئے بنایا گیا ہے نہ کہ انسان سبت کے لئے"۔ سینٹ پال نے اسی حقیقت کو ان جامع اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "الفاظ جان لیوا

ہیں مگر معانی جان بخش ہیں"۔ کسی زمانے میں ہمارے انگریزی قانون میں اِس حقیقت
کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں بائیبل کا نیا نیا ترجمہ انگریزی میں
ہوا تھا۔ ہمارے جج اسے پڑھا کرتے تھے اور اُن کے فیصلے بلاشبہ اِس سے
اثر پذیر ہوا کرتے تھے۔ وہ قانون کی محض لفظی تعبیر پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ
ہمیشہ اُس خرابی یا کمزوری کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے جسے رفع کرنے کے لئے قانون
بنایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ قانون سازوں کے مقصود و مدعا (Intention.) کو زندگی اور
قوت بخشتے تھے لیکن انیسویں صدی میں اِس وسیع نقطۂ نظر کو ایک ایسے
قاعدے میں بدل دیا گیا جو بیرن پارک کے الفاظ میں "زرّیں اصول" تھا۔ ان کا
نقطۂ نظر یہ تھا کہ تمام قوانین و معاہدات کے الفاظ کی تعبیر لغت اور گرامر کی روشنی میں
کی جانی چاہیئے، خواہ اس کے نتیجے میں عدل، قانون اور قانون سازوں کا اصل مدعا
بالکل فوت ہو جائے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جج بالکل آنکھیں بند
کر لیں، ہاتھ باندھ لیں اور صورتِ حال کی ساری خرابی کا الزام مقننہ کے سر ڈال
دیں۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ الفاظ کی غلامی میں مبتلا ہوئے بغیر عبارت کی ایسی
معقول توضیح و تاویل کی جانی چاہیئے جو قرینِ عدل و انصاف ہو۔ حق اور صداقت
تک رسائی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔

عدل و انصاف | حق پرستی اور ایفائے عہد کے بعد آئیے اب عدل و
انصاف کو لیں۔ میرے خیال میں اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان

کو ہمیشہ ہر معاملے میں عادلانہ اور منصفانہ رویہ اختیار کرنا چاہئیے۔ ہمارے ہاں انصاف کا مفہوم بالکل وہی ہے جیسے مسیحی تعلیمات میں "محبت" (ص ۷۰-۲) کا نام دیا گیا ہے۔ آرک بشپ آف کنٹربری ولیم ٹمپل کا بھی یہی خیال ہے اور میں انھیں موجودہ صدی کے عظیم ترین مفکرین میں شمار کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں "یہ امر مسلم ہے کہ عیسائیت میں غالب اور امتیازی عنصر "محبت" ہوتا ہے اور اجتماعی تعلیمات میں محبت کا ظہور "عدل" کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو انجیل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ کسی فقیہ نے حضرت مسیح سے پوچھا "اے میرے آقا! حیاتِ ابدی کیسے نصیب ہوتی ہے؟" آپ نے جواب دیا "کتاب میں تم نے کیا پڑھا ہے؟" اس نے جواب دیا "لکھا ہے کہ تم اپنے خداوند خدا سے دل و جان سے محبت کرو اور اپنے ہمسائے سے ایسی محبت کرو جیسی تمھیں اپنے آپ سے ہے"۔ حضرت مسیح نے فرمایا "تم نے ٹھیک جواب دیا ہے۔ اس پر عمل کرو اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے"۔ خالق و مخلوق سے محبت کا یہ تصور بنیادی طور پر مذہبی تصور ہے اور زندگی کے اکثر معاملات میں اس کا عملی ظہور منصفانہ برتاؤ ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ آپ ایک مثال فرض کیجیے کہ ٹریڈ یونین اور کارخانہ داروں کا جھگڑا چل رہا ہے اور کارخانے میں ہڑتال کا سخت خطرہ ہے۔ اب ٹریڈ یونین کیسی کو "محبت" کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے مگر وہ کس سے محبت کرے مزدوروں سے یا کارخانہ داروں سے۔ جواب یہ ہے کہ "دونوں سے"۔ آپ پھر یہ سوال کریں گے

کہ عملاً اس جواب سے کوئی رہنمائی نہیں حاصل ہو رہی کہ کس طرح کی تجاویز مانی یا منوائی جانی چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں باہمی محبت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں سے انصاف برتا جائے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ ایک انتہائی غیر جانبدار ٹریبونل تشکیل کیا جائے جس پر دونوں فریقین کو پورا پورا اعتماد ہو، ہر فریق اس کے سامنے اپنا اپنا مقدمہ پورے زور اور دلائل کے ساتھ پیش کرے اور ہر فریق اس بات کا پختہ عزم کرلے کہ فیصلہ بلا چون و چرا شرح صدر کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔ اس طرح سے دونوں کے ساتھ یکساں سطح پر انصاف ہوگا اور یہ ہمارے اس مذہبی اصول کے بالکل مطابق ہوگا کہ "تو اپنے ہمسائے سے ویسی ہی محبت کر جیسی تو اپنے نفس سے کرتا ہے"[1]

عدالت کا فریضہ

فریقین تنازعہ کے بارے میں ہم نے دیکھ لیا کہ مذہب کی روشنی میں ان کا طرز عمل کیا ہو جس سے "محبت" کا تقاضا پورا ہو۔ آئیے اب دیکھیں کہ تنازعہ جس جج کے سامنے پیش ہوگا اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اسے بھی انصاف سے کام لینا چاہیئے۔ مگر اسے کیسے معلوم ہوگا کہ انصاف کس شے کا نام ہے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایک بہت بڑے جج نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا ہے۔ ایک مرتبہ

[1] "عیسائیت اور نظامِ اجتماعی" (Temple: Christianity & the Social order.)

دیک شربت ساز نے ایسی لاپروائی سے مشروبات کو تیار اور بند کیا کہ ایک بوتل میں جیتا جاگتا گھونگا داخل کر دیا گیا۔ یہ بوتل اُس سے ایک دُکاندار نے اور دُکاندار سے ایک گاہک نے خریدی۔ گاہک کی بیوی نے پیا اور بیمار ہو گئی۔ پہلے زمانے میں ایسے معاملات کے بارے میں قانون کا فیصلہ یہ تھا کہ مال کا تیار کرنے والا ایسے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے کیونکہ آخری خریدار کے ساتھ اُس کا براہِ راست کوئی لین دین کا معاملہ نہیں ہوا لیکن ۱۹۳۲ء میں ہاؤس آف لارڈز نے یہ پاس کر دیا کہ صنّاع اِس طرح کے نتائج کا ہر لحاظ سے ذمہ دار ہے۔ اس کی بنا لارڈ ایٹکن (Lord Atkin) کا وہ فیصلہ تھا جو مسیحیت کی تعلیمات کا صحیح مظہر تھا اور جس میں اُنھوں نے لکھا تھا:

"ہم ہمسائے سے محبّت کے اصول کا انطباق قانون کی دُنیا میں اِس طرح کرتے ہیں کہ ہمسائے کو کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہیئے۔ آپ کو پوری اور معقول احتیاط برتنی چاہیئے کہ آپ کوئی ایسا کام نہ کریں یا کرنے سے باز نہ رہیں جس کے کرنے یا باز رہنے سے بجا طور پہ توقع کی جاسکتی ہو کہ آپ کے ہمسائے کو تکلیف پہنچے گی۔ اب وکیل پُوچھتا ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہمسایہ کون ہے؟۔ اِس کا صحیح جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائے وہ لوگ ہیں جو میرے فعل سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں اور اتنے قریب سے متاثر ہوتے ہیں کہ فعل کے صدور کے وقت ان لوگوں کے متاثر ہوتے

کا امکان بجا طور پر میرے ذہن میں موجود ہونا چاہیئے"۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا جج قانون کے اصول کو ـــــ نہیں، بلکہ انصاف کے اصول کو دینی تعلیمات سے اخذ کرے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک جج اگر اس ماخذ اور سرچشمے کی طرف رجوع نہ کرے تو پھر اور کہاں جائے۔ بعض لوگ فطری انصاف (Natural Justice) کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا کہ یہ ایک ایسی شے ہے جسے ہر شخص آپ سے آپ جانتا ہے خواہ اُس کی پرورش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہوئی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے اندر انصاف اور سارے اخلاقِ حسنہ کے تصورات کا نشوونما ایک لمبے تاریخی پس منظر کے تحت ہوا ہے۔ انگلستان کے قانونِ عامہ (Common Law) کو صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد اُن ججوں نے اپنے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے جن کی تعلیم و تربیت عیسائیت کے مذہبی ماحول میں سرانجام پاتی رہی تھی۔ عدل و انصاف کے مقتضیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ ہمیشہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

جرائم کا سدِّباب

اب آپ دیکھیئے کہ جرائم کی روک تھام کے لئے کس طرح مذہب اور قانون دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے اور مذہب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے

کہ معاشرہ بہت حد تک وہ حالات پیدا کرتا ہے جو جرائم کے ارتکاب کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے ہاں گھریلو زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر چکا ہے۔ اکثر کم سن اور نابالغ مجرمین اُجڑے ہوئے گھرانوں (Broken Homes) میں سے فرد ا ہو رہے ہیں۔ ایک نوعمر انسان جب اپنے گرد وپیش کے ماحول میں اپنے لئے کوئی ماویٰ و ملجا نہیں پاتا تو وہ اس بے رحم دُنیا سے لڑنے کا عزم کر لیتا ہے۔ اُس کے اندر لا انتہا اجتماعیت کُش اور مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگ جاتی ہے۔ یہ برباد اور ویران گھرانے جو کثیر تعداد میں مجرمین فراہم کرتے ہیں، ہمارے اُس معاشرہ کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں جو رشتۂ ازدواج کا احترام کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے، جو اپنے اخلاقی اقدار و معیارات کو خیرباد کہہ رہا ہے اور جو اپنے مذہب سے قطع تعلق کر رہا ہے۔ معاشرے کی اصلاح کئے بغیر محض مجرموں کی اصلاح کے لئے کوشش کرنا مرض کو چھوڑ کر مرض کے علامات کے پیچھے پڑنا ہے۔ ہم مرض کو جڑ سے اکھیڑنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے پوری سوسائٹی کی اصلاح لابدی ہے اور اس ضمن میں مذہبی اور اخلاقی مصلحین اور رہنماؤں کی ذمہ داری بہت کٹھن ہے۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے سب سے اونچے گھرانوں میں خانگی ناچاقیوں اور ازدواجی جرائم کی مثالیں روز افزوں ہیں۔

فرد کی ذمہ داری | جرائم کی ذمہ داری اگرچہ معاشرے پر بھی عائد ہوتی ہے

لیکن نہ تو قانون کی نگاہ میں اور نہ ہی مذہب کی نگاہ میں فرد کو بری الذمّہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ عیسائیت کی رُو سے ایک فرد بھی اپنے گناہوں کا بہت حد تک ذمّہ دار ہے۔ عیسائیت ایک خطاکار کو یہ کہہ کر معاف نہیں کر دیتی کہ تُم جاؤ تمہارے کنبے یا تمہارے ماحول نے ایسا کرنے پر تمہیں مجبور کر دیا تھا۔ اُس سے یہ کہنا تو اُسے یہ اطمینان دلاتا ہے کہ بُرائی کی روک تھام اور اُس کے خلاف انفرادی جدوجہد بالکل غیر ممکن اور غیر ضروری ہے۔ عیسائیت کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ وُہ مجرم سے تائب و نادم ہونے اور آئندہ اصلاح کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہماری دُعا کی کتاب (Book of Common Prayer) کا اوّلین فقرہ یہ ہے: "جب گناہ گار اپنے گناہ سے باز آجاتا ہے اور نیکی کا کام کرتا ہے تو وُہ اپنی رُوح کی زندگی اور سلامتی کو محفوظ کر لیتا ہے" سینٹ لیوک (St. Luke) نے فرمایا ہے "جب خدا ایک پشیمان خطاکار کو اپنے حضور میں دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے"۔ ایک سزاوار مجرم کے اندر خیانتِ نفس (Guilty Mind.) کے احساس کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہے سینٹ آگسٹائن کے بقول اس احساس کے بغیر تطہیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہنری اول کے عہد میں تو اس بات کو بطور ایک قانونی دفعہ کے ثبت کیا گیا تھا کہ "جرم وہ ہے جس پر ضمیر ملامت کرے"۔ اگر غور و تامّل سے دیکھا جائے تو آج بھی قانونی جرائم کی بنیاد یہی نظریہ ہے کہ جو فعل اخلاقی لحاظ سے قابلِ مذمت

ہے، قانونی لحاظ سے وہی مستوجب سزا و عقوبت ہے۔ گویا ایک فعل کے "جرم" ہونے کے لئے اس کا "گناہ" ہونا ضروری ہے۔

فرد اور جماعت

اسی بحث کے دوران میں یہ بنیادی سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت، ____ شہری اور ریاست ____ کے باہمی تعلقات و حقوق کی تعیین کس طرح سے ہو۔ حق اور انصاف کوئی مجرد تصورات نہیں ہیں کہ ایک فکری خلا کے اندر اُن کا تصور کیا جا سکتا ہو، ان کا عملی مظاہرہ ایک جماعت یا دوسرے لفظوں میں ریاست کے وجود کے تحت ہی ہوتا ہے۔ اب ریاست اور معاشرے کو ایسی بنیاد پر بھی استوار کیا جا سکتا ہے جہاں حق اور عدل کا گلا بالکل گھونٹ دیا جائے اور صرف اس کا ذکرِ خیر ہی باقی رہ جائے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے پھر مذہب کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ مذہب کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے میں پھر ولیم ٹمپل کے الفاظ مستعار لوں گا۔ وہ فرماتے ہیں "مسیحی اخلاقیات اور مسیحی سیاست کا ابتدائی اصول یہ ہے کہ ہر فرد بحیثیت فرد کے انفرادی اعزاز و احترام کا مستحق ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت خدا کی مخلوق ہے جس سے خدا محبت کرتا ہے تو معاشرے کے حق میں ایک فرد کی افادیت سے قطع نظر ہر فرد کی ایک مستقل بالذات شخصی قدر و قیمت ہے۔ فرد کا درجہ اوّلین ہے اور جماعت کا درجہ ثانوی۔ ریاست

شہری کے لئے ہے نہ کہ شہری ریاست کے لئے"۔ عیسائیت نے ہمیشہ اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ ریاست کو کلی، آخری اور مطلق اقتدار حاصل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اقتدار کو اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتی ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "اقتدار کسی کو حاصل نہیں سوائے اللہ کے۔ تمام حکمران خدا کے محکوم ہیں"۔ یہی تو وہ سپر ہے جس سے مسلح ہو کر ہمارے آباؤ اجداد نے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا تھا۔ سینٹ پال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ریاست تو نیکی کے قیام ہیں خدا کی نائب ہے (Minister of God for Good)"۔ "جب تک ریاست اپنی مقدس امانت کو ادا کر رہی ہے، اس کی مزاحمت جائز نہیں لیکن جب وہ حد سے تجاوز کر کے اقتدار مطلق (Absolute Power) کی مدعی بنتی ہے تو اس کی مزاحمت حق بجانب ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جن آدمیوں میں جبلی طور پر جنسی یا بعض دوسرے وحشیانہ جرائم کے ارتکاب کا میلان ہو، انہیں بانجھ بنا دینا چاہیئے یا غیر محدود عرصے کے لئے انہیں محبوس کر دینا چاہیئے یا قتل کر دینا چاہیئے لیکن ہمارے ملک میں کسی شہری سے یہ سلوک روا رکھنے کی قانوناً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مذہبی تعلیمات کا ثمرہ ہے۔ مذہب کی رو سے آزادی، زندگی اور زندگی کو وجود میں لانے والے توالد و تناسل

کے ذرائع سب مقدس و محترم ہیں۔ یہ خدا کا عطیہ ہیں اور وہی انھیں ہمیشہ کے لیئے واپس لے سکتا ہے۔ اگر ریاست کو ان عطیات پر ہاتھ ڈالنے کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو وہی کچھ ہو گا جو نازی ریاستوں نے کیا، یعنی انھوں نے اپنے سیاسی مخالفین پر یہ حربے آزمانے شروع کر دیئے۔ میرے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل سوائے اس کے نہیں ہے کہ ہم مذہب سے رجوع کریں وہی ہمیں بتلائے گا کہ شہری اور ریاست کے حقوق میں توازن کی صحیح صورت کونسی ہے۔

ایک تاریخی واقعہ

جیمز اوّل (James I) کے عہد میں ایک مشہور و معروف واقعہ پیش آیا۔ اُس نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح انگلستان میں حکومت کر سکتا ہے اور عدالتوں میں استغاثہ و مرافعہ کے بغیر وہ ہر معاملے میں آخری فیصلہ دے سکتا ہے۔ آرک بشپ بین کرافٹ (Bancroft) نے بھی بادشاہ کی تائید کی۔ لیکن اُس زمانے میں ایک بہت بڑے لارڈ چیف جسٹس تھے جن کا نام تھا لارڈ کوک (Lord coke)، وہ اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے (اور ان کی کثیر مصروفیتوں کے ساتھ تعجب ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر لیتے تھے)۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا "تمھیں فیصلے چکانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں"۔

بادشاہ نے کہا "میں نے تو یہ سُن رکھا ہے کہ تمہارے قوانین کی بنا عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے بھی کم تر عقل ہے"۔ چیف جسٹس نے جواب دیا "آپ بلاشبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہیں لیکن قانون کے لئے بڑے تجربے اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک سنہری پیمانہ ہے جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہے اور خود حضورِ والا کی حفاظت کی جاتی ہے"۔ بادشاہ نے انتہائی غضبناک ہو کر کہا "کیا میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہے"۔ لارڈ کوک نے بریکٹن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "بادشاہ کسی آدمی کا محکوم نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا محکوم ہے"۔

دستور کا سنگِ بنیاد

بریکٹن (Bracton) کے جو الفاظ ہمارے قاضی القضاۃ کوک نے نقل کئے تھے، یہ درحقیقت ہمارے دستور کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہیں "خدا اور قانون سے بادشاہ کے بالاتر نہ ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ (Executive.) قانون کے ماتحت ہے۔ ہمارے قانون دان جب یہ دستوری کلیہ بیان کرتے تھے تو وہ درحقیقت اپنا ایک مذہبی عقیدہ دہرا رہے ہوتے تھے۔ اگر ہم اس عقیدے کو فراموش کر بیٹھیں تو ہمارا انجام کیا ہوگا اور اس خود فراموشی کی زد کہاں کہاں جا کر پڑے گی۔ اس کے دور رس نتائج و عواقب کا مشاہدہ کرنے کے لئے آپ ایک نظر اٹھا کر دنیا کی آمرانہ ریاستوں کو دیکھ لیں۔ وہاں کیا

کو فرد پر مقدم قرار دے کر فرد کے وجود کو ریاست میں گم کر دیا گیا ہے وہاں شہری ریاست کے لئے زندہ ہے نہ کہ ریاست شہری کے لئے۔ وہاں کے حکمران "خدا اور قانون کے تابع" نہیں ہیں۔ وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہیں۔ تمام قوانین اور تمام عدالتیں انتظامی مشینری کے ہی کل پرزے ہیں! ان کا کوئی مستقل اور آزادانہ وجود نہیں ہے۔ فرد کی آزادی کی حقیقت خواب و خیال سے بھی کم تر ہے! ایسی ہولناک مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف اور حیاتِ انسانی پر ایسے مہیب آہنی تسلط کے خلاف، ہمارا مذہب پورے زور اور پوری قوت کے ساتھ احتجاج کرتا ہے!

اب میں اپنی بحث کو ختم کرتا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ بحث کسی نتیجے پر پہنچ کر ختم ہو رہی ہے۔ بلاشبہ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم حق اور عدل کے متلاشی ہیں تو ہم اسے بحث مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے سے معاشیے اور غور و فکر کے ذریعے سے دریافت نہیں کر سکتے۔ صداقت اور انصاف تک رسائی نیکوکاری اور دینداری کی وساطت ہی سے ہو سکتی ہے۔ سچائی اور انصاف کی پہچان روح کو ہے اور روح کو زندگی اور جلا مذہب کے طفیل ہی ملتی ہے۔ قانون تو سچائی اور انصاف کو نافذ اور منطبق کرنے کا محض ایک ناقص اور ادھورا وسیلہ ہے جس کا ظہور صرف خارجی لین دین اور ظاہر کے معاملات میں ہوتا ہے۔ جس دن روئے زمین پر سے مذہب کا

خاتمہ ہو جائے گا، اُسی دن زمین پر سے سچائی اور عدل کا بھی جنازہ اُٹھ جائے گا۔ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے دُور ہٹے اور دُور رہے ہم پر مدت ہائے دراز گزر چکی ہیں۔ آئیے ہم اس کی طرف لوٹیں کیونکہ یہی اور صرف یہی ایک شے ہے جو ہمیں بچا سکتی ہے !!

الإسلام وأوضاعنا القانونية

باللغة الأوردية

عبد القادر عودة

١٠